57

سماجی انصاف
اور
اجتماعیت

تالیف: مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

ترتیبِ جدید، تقدیم و تحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد



سماجی انصاف اور اجتماعیت

تالیف

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ

ترتیب جدید، تقدیم و تحقیق

مفتی عبدالخالق آزاد

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح)، لاہور

فون: 0092-42-36307714, 36369080 ویب سائٹ: www.rahimla.org

کتاب	.......☆.......	سماجی انصاف اور اجتماعیت
تالیف	.......☆.......	مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ
ترتیبِ جدید، تقدیم وتحقیق	.......☆.......	مفتی عبدالخالق آزاد
اشاعت	.......☆.......	اپریل 2011ء
مطبع	.......☆.......	علی فرید پرنٹرز، لاہور
اہتمام	.......☆.......	ناظم "رحیمیہ مطبوعات"
برائے	.......☆.......	"رحیمیہ مطبوعات"، 33/A کوئینز روڈ، لاہور 0092-42-36307714,36369089
قیمت	.......☆.......	



انتساب

ان پُرعزم اور باشعور نوجوانوں کے نام

جو

انسانی اجتماع کی تشکیلِ نو کے لیے

دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں

سماجی عدل وانصاف

کے لیے سرگرمِ عمل ہیں!

فہرست کتاب

☆☆☆☆☆

تقدیم

سماجی انصاف؛ ایک بنیادی قدر

سماجی انصاف (Social Justice) انسانی سماج کی وہ بنیادی قدر ہے کہ جس کے بغیر معاشرے ہموار طریقے سے ترقی نہیں کرتے۔ ہر معاشرے کی درست تشکیل کے لیے سماجی انصاف بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ جن معاشروں میں سماجی انصاف نہیں ہوتا، وہ روبہ زوال ہوجاتے ہیں۔ اور ترقی کی منازل طے کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس لیے ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک انسانی ترقی کے لیے سماجی انصاف کی بنیادی اہمیت رہی ہے۔ کسی معاشرے نے بھی اس کے بغیر ترقی نہیں کی۔

نبویؐ انقلاب کی بڑی خصوصیت؛ سماجی انصاف

تمام ادیان کی بنیادی تعلیمات میں سماجی انصاف پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ خاص طور پر دین اسلام کی سچی تعلیمات اس حوالے سے بڑی جامعیت کی حامل ہیں۔ نبویؐ انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ آپؐ نے انسانی اجتماع میں سماجی انصاف کو اولین اہمیت دی۔ اور بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہب انسانی مسائل حل کرنے کے لیے نہ صرف ایک مکمل سیاسی، معاشی اور سماجی نظام دیا، بلکہ ایک مکمل فکر و نظریہ اور فلسفۂ حیات بھی دیا۔ مسلمانوں کے غلبے کے ایک ہزار سالہ دور میں سماجی انصاف کے اس فلسفہ وفکر کی اساس پر مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں ایک ایسا عالمی سماجی نظام تشکیل دیا گیا، جس نے انسانیت کے مسائل حل کیے اور ان کی قومی اور بین الاقوامی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔

سماجی انصاف سے دوری اور مسلمانوں کا زوال

مسلمانوں پر جب زوال آیا اور ان کا سیاسی و معاشی نظام ختم ہوا تو فکری اور نظریاتی

حوالے سے بھی ان میں فرسودگی، جمود اور تنگ نظری پیدا ہوئی۔ غلامی کے اثرات نے مسلمان معاشروں میں زوال کو مزید گہرا کردیا۔ اور مسلمان معاشروں کی بحیثیت مجموعی حالت یہ ہوگئی کہ وہ سیاسی شعور سے بے بہرہ، معاشی اور اقتصادی طاقت سے محروم اور سماجی فکر وفلسفے کے حوالے سے فکری ژولیدگی اور نظریاتی انتشار کا شکار ہوگئے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں سماجی انصاف کی اہمیت ان کے دل و دماغ سے نکل گئی۔

ایسے حالات میں ایسے مذہبی گروہ بھی وجود میں آ گئے، جنھوں نے سماجی انصاف کی بنیادی قدر کو نظرانداز کرتے ہوئے مذہب کے رسمی تصور کو فروغ دیا۔ عقائد و افکار کے حوالے سے ترقی پسند سوچ کے بجائے تنگ نظری اور عصبیت پر مبنی محدود سوچ کو آگے بڑھایا۔ سیاسی اور معاشی افکار وخیالات کو دین کی تعلیمات سے علاحدہ کر کے سوسائٹی میں موجود غلامی پر مبنی سماجی ناانصافی کے نظام کو فروغ دینے میں کردار ادا کیا۔ ایسی ''اسلام پسند'' جماعتیں اور گروہ وجود میں لائے گئے، جنھوں نے دین اسلام کی بنیاد پر سماجی ناانصافی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ محض رسمی اعمال کی تو دعوت دی، مگر انسانی مسائل کے حل کرنے کے لیے دینی تعلیمات کی جامعیت اور اس کے عدل و انصاف کے نظریے کو فروغ دینے کے لیے کوئی کدوکاوش نہیں کی۔ اور بہتر اجتماعیت قائم کرنے کے لیے سماجی انصاف کی اہمیت پر قطعی زور نہیں دیا۔

سماجی نااِنصافی کے خلاف ولی اللّٰہی جماعت کا کردار

زوال کے اس دور میں صرف ایک جماعت ایسی تھی، جس نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار وخیالات اور فلسفہ وفکر کے تناظر میں سوسائٹی میں موجود سماجی ناانصافی، اقتصادی ناہمواری اور سیاسی غلامی کے خلاف آواز بلند کی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے توانا فکر و فلسفے نے اس خطے کی غلامی کے خلاف آزادی کی تحریک پیدا کی۔ اقتصادی ناہمواری اور طبقاتی نظام کے خلاف واضح نظریہ اور شعور دیا۔ سماجی ناانصافی کے خلاف عدل و انصاف پر مبنی اجتماعیت قائم کرنے پر زور دیا۔ سماجی انصاف کے قیام کے لیے بنیادی اساسی اصولوں کی نشان دہی کی۔ اور اسلام کی سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کیا۔ اور اسی سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر برعظیم پاک و ہند کی غلامی کے خلاف بڑی

توانا آواز بلند کی اور آزادی اور حریت کے لیے قربانیاں دیں۔

یہ جماعت حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ان کے صاحب زادگان اور ولی اللّٰہی سلسلے سے وابستہ علمائے حق کی ہے۔ جس نے اس سلسلے میں بڑی جدوجہد اور قربانیاں دیں۔ چناں چہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سماجی ناانصافی کے خلاف مزاحمتی فکر و نظریہ دیا۔ اور سماجی انصاف پر مبنی اجتماعیت کے قیام کے لیے بھرپور جدوجہد اور کوشش کی۔ اور اس حوالے سے دین اسلام کی سچی تعلیمات کی نہ صرف فکری اور نظریاتی حوالے سے نشان دہی کی، بلکہ اس کے قیام کے لیے عملی جدوجہد کی اور بڑی قربانیاں دیں۔ اور صعوبتیں برداشت کیں۔

دورِ حاضر میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی جدوجہد

ولی اللّٰہی سلسلے کی ایک عظیم شخصیت امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہیں۔ جنھوں نے جدید دور کے تقاضوں کے تناظر میں سماجی انصاف اور اجتماعیت کے حوالے سے دین اسلام کی جامع تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اور سماجی انصاف کی بنیاد پر سوسائٹی کی تشکیل نو کے لیے ولی اللّٰہی فکر و فلسفے کو متعارف کرانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد اور کوشش کی۔ آپؒ نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کا گہری نظر سے مطالعہ اور غور و تدبر کر کے ان کے سیاسی، معاشی اور سماجی فکر و فلسفے کا تعین کیا۔ اور اس کی روشنی میں اس خطے کی اجتماعیت کو سماجی انصاف پر قائم کرنے کے لیے مقالات اور کتابیں لکھیں اور عملی جدوجہد اور کوشش کی۔ اور ایسے افراد تیار کیے، جنھوں نے آگے چل کر اس حوالے سے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کا کام

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگردوں میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصل کتابوں

کی تحقیق و تدوین کا کام کیا، بلکہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفے کی وضاحت کے لیے بہت سے مقالات اور تحریرات قلم بند کیں۔ حیدر آباد سندھ میں ''شاہ ولی اللہ اکیڈمی'' قائم کی۔ اور اس سے ''الرحیم'' اور ''الولی'' کے نام سے ماہ وار اردو اور سندھی مجلات شائع کیے۔ جن میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفے اور امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تشریحات کی روشنی میں اہم مقالہ جات شائع کیے۔ اور شاہ صاحبؒ کی کتابوں کو عمدہ تحقیق و حواشی کے ساتھ ازسرِ نو شائع کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس حوالے سے ان کی کدو کاوش کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

زیرِ نظر کتاب کی اہمیت

زیرِ نظر کتاب ''سماجی انصاف اور اجتماعیت'' بھی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی ایک ایسی ہی کاوِش ہے، جس میں انھوں نے سماجی انصاف کے حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفے کی جامعیت بیان کی ہے۔ اور دینِ اسلام کی سچی تعلیمات کی روشنی میں ایک بہتر اجتماعیت قائم کرنے کے بنیادی اساسی اصولوں کی نشان دہی کی ہے۔ خاص طور پر اقتصادیات کے حوالے سے اسلام کے اساسی اصولوں کی تشریحات اور ان کی وضاحت کے لیے فقہائے اسلام کے اہم فتاویٰ اور ان کی فقہی آرا جمع کر دی ہیں۔

اس کتاب کی گزشتہ اشاعتوں پر ایک نظر

یہ کتاب سب سے پہلے ''شاہ ولی اللہ اکیڈمی'' حیدرآباد سندھ سے 1973ء میں طبع ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد کئی بار اکیڈمی سے ہی شائع ہوئی۔ لاہور کے بعض پبلشر حضرات نے بھی اسے کئی بار شائع کیا۔ کافی عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اس کے بعض مقامات کی وضاحت اور تشریح کی جائے۔ مثلاً اس میں ایک جگہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت کے چار اصولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن صرف ایک اصول کا تعارف کرایا گیا۔ باقی اصول کون سے ہیں؟ اس حوالے سے تشنگی باقی رہتی تھی۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے اور سرمایہ داری اور سوشل اِزم کے فلسفوں کے باہمی موازنے کے حوالے سے بھی اجمالی بحث کی گئی تھی۔ اس کی تشریح کی بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

نیز جاگیرداری نظام کے حوالے سے بھی مزید تفصیلات سامنے آنا ضروری تھیں۔

اس کتاب کی جدید ترتیب وتحقیق کی نوعیت

اس لیے ان امور کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب کی زیرنظر اشاعت میں ہم نے اس کی نئی ترتیب قائم کی ہے۔ اس ترتیب میں مذکورہ بالا امور پر مزید وضاحت، اضافے اور تحقیقات شامل کی گئی ہیں۔ مزید استفادے کے لیے اس کتاب کو درجِ ذیل چار عنوانات پر تقسیم کر کے ان سے متعلقہ مواد کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ہر عنوان کو ایک مستقل فصل کے طور پر مرتب کر دیا گیا ہے۔ اب اس کتاب کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

1۔ فصل اول: حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے فکر و فلسفے کی جامعیت

2۔ فصل دوم: اسلام کا قانونِ ملکیت اور قانونِ انفاق

3۔ فصل سوم: اسلام کا نظریۂ معیشت اور جاگیرداری نظام کی خرابی

4۔ فصل چہارم: انسانی معاشرہ اور اس کا سماجی ارتقا

فصل اول کے عنوان کے تحت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت کے چار اصولوں میں سے باقی تین اصولوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اصل میں مصنفؒ نے یہ بحث امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی کتاب "التمهيد لتعريف ائمة التجديد" سے اَخذ کی ہے۔ اس لیے اصل کتاب کو سامنے رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دعوت کے چاروں بنیادی اساسی اصولوں کا خلاصہ اس جگہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس عنوان کے تحت حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کی مزید وضاحت پیش کی گئی ہے۔ اور سوشل اِزم اور کیپٹل اِزم کے فلسفوں کے بنیادی امور اور اساسی نظریات کی نشان دہی کی گئی اور پھر ان تینوں فلسفوں کے باہمی موازنے کے حوالے سے مفید اضافے کیے گئے ہیں۔ تاکہ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلو وضاحت کے ساتھ سامنے آجائیں۔ نیز حواشی میں یورپین فلسفوں کے اساسی نظریات کا خلاصہ اور شاہ صاحبؒ کے فلسفے کا بنیادی خاکہ تحریر کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسری فصل کے عنوان کے تحت کچھ نئے حوالہ جات آ گئے ہیں۔ اور تیسری فصل میں جاگیرداری نظام سے متعلق محققین علمائے اسلام کی وہ آرا جمع کر دی گئی ہیں، جنھیں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی کتاب "اسلام کے اقتصادی نظام" میں

بیان کیا ہے۔ چناں چہ مولانا سیوہارویؒ کی اس کتاب کے آخری مبحث کو مزید حوالوں کے ساتھ یہاں پیش کردیا گیا ہے۔ اسی طرح چوتھی فصل کے تمام مواد کو بھی اصل کتابوں سے مراجعت کے بعد ایک جگہ پر مرتب کردیا گیا ہے۔

اسی کے ساتھ اس کتاب میں موجود تمام حوالہ جات کی نئی تخریج کی گئی ہے۔ اور اہم مقامات پر ضروری تحقیقی حواشی کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ نیز مؤلف کتاب حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شروع میں اضافہ کردیے گئے ہیں۔ اور سماجی عدل و انصاف کی اہمیت کے حوالے سے مؤلف کتاب کی ایک اہم تقریر کی نوک پلک درست کرکے اِسے بطورِ مقدمہ شروع میں لگا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب نئی ترتیب و تدوین اور تحقیق کے ساتھ قارئین کے لیے زیادہ مفید بن کر سامنے آتی ہے۔ نوجوانوں کے شعوری مطالعے کے لیے یہ نئی ترتیب یقیناً مفید ہوگی۔ اور سماجی انصاف کے حوالے سے اجتماعیت پر مبنی شعور کے فروغ کے لیے بنیادی کردار ادا کرے گی۔

مؤلف کتاب کا حضرت رائے پوری سے تعلق

مؤلف کتاب حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کا حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ سے بہت گہرا تعلق تھا۔ حضرت سندھیؒ کے تعلق کی وجہ سے دونوں حضرات میں باہمی محبت و مودّت تھی۔ دین اسلام کی سچی تعلیمات کو ولی اللّٰہی جماعت کے افکار کی روشنی میں دنیا میں غالب کرنے کے حوالے سے دونوں حضرات کا نقطہ نگاہ یکساں تھا۔ اس لیے حضرت الاستاذ مولانا قاسمیؒ، حضرت اقدس رائے پوری کے نوجوانوں میں کام کرنے کے انداز و اُسلوب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اور اس کی بھرپور حمایت اور علمی تعاون کرتے تھے۔

اسی حوالے سے جب حضرت اقدس رائے پوری نے فروری 1987ء میں ولی اللّٰہی علوم و افکار کی اساس پر نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت اور تنظیم کے لیے جدوجہد شروع کی تو سندھ میں اس کام کا آغاز عیدالفطر کے موقعے پر ایک تربیتی اجتماع سے کیا گیا۔ اور اس کے لیے مولانا سندھیؒ کے قائم کردہ مرکز ''دارالرشاد'' گوٹھ پیر جھنڈو ضلع حیدرآباد کا انتخاب کیا گیا۔ یہ تربیتی سیمینار مؤرخہ 05/جون 1987ء، بروز جمعۃ المبارک کو منعقد ہوا۔ اور

اس میں بڑی تعداد میں ولی اللّٰہی علوم و افکار کے حامل نوجوانوں نے شرکت کی۔ اس تربیتی سیمینار میں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے حوالے سے بہت سے مقالات اور تقاریر ہوئیں۔ مختلف حضرات نے اس میں مقالات پڑھے۔ خود راقم الحروف نے امامِ انقلاب مولانا سندھیؒ کی سوانح اور انقلابی افکار کے حوالے سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ جمعہ کی نماز سے قبل حضرت اقدس رائے پوری نے دین اسلام کی انقلابی تعلیمات کی اہمیت پر مفصل خطاب فرمایا تھا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ، حضرت رائے پوریؒ اور حضرت سندھیؒ کے نقطہ نگاہ سے دین اسلام کے عدل و انصاف کو غالب کرنے کی اہمیت بیان کی تھی۔

مولانا قاسمیؒ کی ایک اہم تقریر

اس تربیتی سیمینار میں حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ نے خصوصیت کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اور جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد اپنے استاذ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں سماجی عدل و انصاف کی اہمیت کے حوالے سے ایک اہم تقریر فرمائی تھی۔ جسے تمام حاضرین نے بھرپور توجہ سے سنا۔ اس تقریر میں انھوں نے حضرت اقدس رائے پوری کے کام کی بھرپور تائید اور حمایت بھی فرمائی۔ اور اس حوالے سے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ یہ تقریر مولانا محمد عبداللہ عابد سندھی نے آڈیو کیسٹ سے نقل کر کے مرتب کی۔ اور کئی رسائل میں چھپی تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی اس اہم تقریر کو اس کتاب کے مقدمے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں جہاں اس کتاب کے بنیادی مضامین کا خلاصہ آ گیا ہے، وہیں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی زندگی کے اس حوالے سے چند اہم واقعات بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ نیز حضرت سندھیؒ کی عملی زندگی کے چند پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

”رحیمیہ مطبوعات“ کے اشاعتی مقاصد

”رحیمیہ مطبوعات“ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری کی زیرِ سرپرستی کام کر رہا ہے۔ اور علومِ ولی اللّٰہی کی کتابیں پوری تحقیق و ترتیب کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔ اس سے قبل بھی کئی اہم کتابیں ادارہ کی جانب سے تحقیق و ترتیب کے ساتھ شائع کی جا چکی

ہیں۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت کا مقصد دین کی سچی اور انقلابی تعلیمات سے عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو شعور و آگہی دینا ہے۔ خاص طور پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے سلسلے سے وابستہ اکابرین علمائے حق کے افکار و نظریات سے نوجوان نسل کو آگاہ کرنا ہے۔ اس لیے ادارہ کی جانب سے شریعت، طریقت اور دینی اجتماعیت و سیاست سے متعلق کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ سب کام حضرات مشائخ رائے پور اور ولی اللّٰہی سلسلے سے وابستہ علمائے حق کی توجہات اور فیوضات کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ اس طرح یہ کتاب زیادہ مفید شکل میں نوجوانوں کی رہنمائی کا باعث بنے گی۔

عرضِ مرتب

راقم سطور نے حضرت الاستاذ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور ان کتابوں کے اہم مقامات حضرت قاسمی صاحبؒ سے حل کیے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ حضرت استاذ کی ایک اہم کتاب کی تحقیق و ترتیبِ جدید کرنے کی توفیق عطا ہوئی۔ حضرت الاستاذ نے اس سلسلے میں ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ چناں چہ ایک دفعہ 1988ء میں راقم نے ایک کتاب پر کوئی تحریر لکھنے کی درخواست کی تو حضرت الاستاذ نے اس پر تحریر فرمایا: ”**قد زُرتُ الشابّ الصالح المولوی عبدالخالق فوجدتُہٗ طالبًا بتحقیقات إمام شاہ ولی اللّٰہ دھلویؒ.**“ ان کی اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفے کو گہرائی میں سیکھنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام اساتذہ اور ہمارے تمام ولی اللّٰہی مشائخ کو بلند درجات نصیب کرے۔ جنھوں نے ہمیں دین کے غلبے کے اس فکر و فلسفے کا شعور دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے فیض کو زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(مفتی) عبدالخالق آزاد

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

مؤرخہ 13/اپریل بروز بدھ 2011ء

مؤلف کتاب

حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ

مختصر حالاتِ زندگی

☆ آپؒ کا نام ''غلام مصطفیٰ قاسمی'' اور کنیت ''ابوسعید'' ہے۔ جب کہ آپؒ کے والدِ گرامی کا نام ''الحاج حافظ محمود چانڈیو'' ہے۔

☆ آپؒ کی پیدائش جون 1924ء میں صوبہ سندھ کے مشہور ضلع لاڑکانہ کی تحصیل میروخان کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''بھنبھو خان چانڈیو'' میں ہوئی۔

☆ آپؒ نے ابتدائی تعلیم سندھ کے متقی اور بزرگ عالم دین مولانا خوش محمد میروخانی سے حاصل کی۔ جو حضرتِ شیخ الہندؒ کے شاگرد مولانا غلام رسول ناڑی والوں کے شاگرد تھے۔

☆ آپؒ نے درسِ نظامی کی تعلیم قصبہ ''کورِ سلیمان''، تحصیل قمبر، ضلع لاڑکانہ، سندھ میں ایک بڑی دینی درس گاہ ''دارالفیض'' سے حاصل کی۔ یہ دینی مرکز خلافت تحریک کے دوران مولانا سید پیر تراب علی شاہ راشدیؒ کی تحریک اور استاذ العلما مولانا میر محمد نورنگی کی تائید و برکت سے قائم ہوا تھا۔ اس درس گاہ کے صدرالمدرسین حضرت علامہ مولانا عبدالکریم کورائی تھے۔ علامہ کورائی کا سلسلۂ سند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک اس طرح پہنچتا ہے کہ آپؒ کے استاذ معمر عالم دین مولانا محمد اسماعیل ابڑائی سندھیؒ ہیں۔ اور وہ مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے

شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ بن حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے شاگرد ہیں۔

☆ آپؒ نے فلسفہ اور علوم حدیث کی تعلیم مولانا عبدالکریم کورائی سے حاصل کی۔

☆ دورۂ حدیث شریف کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرۂ العزیز سے حاصل کی۔

☆ دیوبند میں اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں ہی آپؒ نے علم منطق میں ایک کتاب "مفید الطلبا" لکھی۔ جسے اُسی زمانے میں مکتبہ اعزازیہ دیوبند نے شائع کیا۔ اور وہ درسِ نظامی کے نصاب میں شامل رہی۔

☆ 1939ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

☆ پھر دہلی میں حکیم جمیل الدینؒ استاذ حکیم اجمل خان دہلویؒ اور ان کے بیٹے حکیم محمد اسماعیل سے "طبیبِ فاضل" کا امتحان پاس کیا۔

☆ آپؒ کی پہلی بیعت حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ سے تھی۔ اور پھر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی۔

☆ 1939ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ حرمین شریفین سے واپس تشریف لائے تو "دارالرشاد" گوٹھ پیر جھنڈا میں حضرت سندھیؒ سے ترجمہ قرآن حکیم اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کی تمام کتابیں اور علوم و افکار پوری تحقیق کے ساتھ پڑھے اور ان کی تکمیل کی۔

☆ 1941ء میں مدرسہ دارالسعادت گوروپھوڑ تحصیل شکارپور سندھ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہو کر درسِ حدیث دینا شروع کیا۔

☆ اس کے بعد کچھ عرصے تک "بیت الحکمت" میر پور بھٹو ضلع لاڑکانہ سندھ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

☆ تعلیم سے فراغت کے بعد آپؒ نے اپنا سیاسی تعلق جمعیت علمائے ہند سے قائم کیا۔ اور اس کے بنیادی ممبر رہے۔

☆ 1943ء میں تحصیل قمبر ضلع لاڑکانہ کی کانگریس پارٹی کے وائس پریذیڈنٹ

منتخب ہوئے۔ اور پھر اگلے سال ضلع لاڑکانہ کے بھی پریزیڈنٹ رہے۔

☆ 04/اگست 1944ء کو، جب امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے شہدادنگر ضلع لاڑکانہ میں ایک ادارہ قائم کیا، تو اس کے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا کہ:

''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل کالج، شہدادنگر میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور ان کے رفیق خاص عزیز اللہ جروار کی ہمت سے کھولا جاتا ہے۔''

☆ آپؒ جمعیت علمائے ہند کی صوبائی مجلس عمومی کے ممبر بھی رہے۔

☆ 1947ء میں آپؒ گھوٹکی ضلع سکھر کے ایک مدرسے میں شیخ الحدیث رہے۔

☆ 1948ء میں مدرسہ مظہرالعلوم کھڈہ کراچی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور تین سال تک درسِ حدیث دیتے رہے۔

☆ پھر اس کے بعد سندھ مسلم کالج کراچی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔

☆ 1963ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔

☆ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی جانب سے نکلنے والے مجلّات:

[۱] ''الرحیم'' (اردو اور سندھی)

[۲] ''الولی'' (اردو)

[۳] "Al-Samka" (انگریزی)

کے مدیر و مرتب کے طور پر آخر عمر تک کام کرتے رہے۔

نیز سہ ماہی ''مہران'' (سندھی) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی آپؒ شامل رہے۔

☆ پھر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں پی ایچ ڈی کی کلاسز کے لیے ''وزٹنگ پروفیسر'' کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس عرصے میں اردو، سندھی، فارسی، سرائیکی، عربی اور اسلامک کلچر وغیرہ میں تقریباً 32 پی ایچ ڈی مقالات مکمل ہوئے۔

☆ 1979ء میں سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔

☆ آپؒ رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان کے چھ سال تک چیئرمین رہے۔

☆ سندھ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ کے تین سال تک ممبر رہے۔

☆ انجمن ترقی اردو کراچی کے ممبر رہے۔

☆ علاوہ ازیں آپؒ درجِ ذیل اداروں کے ممبر اوران سے وابستہ رہے ہیں:

[۱] انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد
[۲] سندھ میوزیم سنٹر حیدرآباد
[۳] ڈاکٹر داؤد پوتا سندھ پروونشل لائبریری حیدرآباد
[۴] مہران آرٹس کونسل حیدرآباد
[۵] مرکزی پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن اسلام آباد
[۶] اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ ایگریکلچر یونیورسٹی پشاور
[۷] مرکزی زکوٰۃ کونسل اسلام آباد
[۸] اقبال اکیڈمی لاہور

☆ تصنیفات وتالیفات اور کتب کی تحقیقات:

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی درجِ ذیل کتابوں کو تحقیق و حواشی سے مرتب کر کے شائع کیا:

[۱] التفهيمات الإلٰهية (عربی۔ دوجلدوں میں)
[۲] البدور البازغه (عربی)
[۳] تأويل الأحاديث (عربی)
[۴] لمحات (عربی)
[۵] سطعات (فارسی)
[۶] همعات (فارسی)
[۷] الطاف القدس (فارسی)
[۸] خير كثير (اردو ترجمہ اور تحقیق کے ساتھ)
[۹] سطعات (سندھی ترجمہ)
[۱۰] تأويل الأحاديث کے اردو ترجمہ (قصص الانبیا) کا مقدمہ اور حواشی
[۱۱] فتح الرحمن (سندھی ترجمہ)

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی درجِ ذیل کتابیں تصحیح و تحقیق کے ساتھ

مرتب کیں:

[۱] التمهيد لتعريف ائمة التجديد (عربی)

[۲] تفسیر سورة سباء (سندھی املا از مولانا عبیداللہ سندھیؒ)

[۳] خلاصة القرآن (عربی)

[۴] الهام الرحمن (عربی۔ دو جلد)

[۵] مصطلح الحديث (املا مولانا عبیداللہ سندھیؒ)

[۶] سندھی تفسیر از مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ (تین جلدیں)
(املا کردہ مولانا محمد مدنیؒ)

اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر درجِ ذیل کتابوں پر تحقیق وحواشی لکھے:

[۱] مختصر القدوری عربی (مقدمہ اور حواشی)

[۲] المتانة فی مرمّة الخزانة (عربی)

[۳] فرائض الإسلام (عربی) از مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھویؒ

[۴] إمعان النظر شرح نخبة الفكر (عربی) از مخدوم محمد اکرم نصرپوریؒ

[۵] بهجة النظر شرح نخبة الفكر (عربی) از مخدوم ابوالحسن صغیر سندھیؒ

[۶] انباء الأنباء فی حياة الأنبياء (عربی) از مخدوم ابوالحسن صغیر سندھیؒ

[۷] کچکول نامہ (فارسی) از مخدوم ابوالحسن صغیر سندھیؒ

[۸] رسالو شاہ عبداللطیف بھٹائی (مقدمہ اور معانی کے ساتھ)

[۹] مفيد الطلباء (عربی) علم منطق میں رسالہ تصنیف کیا۔

[۱۰] سماجی انصاف اور اجتماعیت (اردو)

☆ آپؒ نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الآرا کتاب "حجة الله البالغه" کی امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی عربی شرح کی تحقیق وتدوین کا کام بھی شروع کیا تھا۔ اور کئی مباحث پر کام ہو چکا تھا۔ ابھی کام جاری تھا کہ آپؒ کا وِصال ہوگیا۔

☆ اس کے علاوہ آپؒ نے اردو اور سندھی میں بے شمار مقالات اور تحریرات قلم بند

کیں۔ اور بہت سے تحقیقی مقالات کی رہنمائی فرمائی۔

☆ جون 1987ء میں مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری کے زیرِ سرپرستی ولی اللّٰہی علوم و افکار پر منعقدہ ایک سیمینار میں شرکت کی اور ایک اہم تقریر فرمائی۔ جس میں حضرت رائے پوری کے کام کی بھرپور تائید کی۔

☆ شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں چالیس سال (1963ء تا 2003ء) تک حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں پوری تحقیق کے ساتھ پڑھائیں۔ اور اس عرصے میں ہزاروں طلبا نے آپ سے علومِ ولی اللّٰہی کی تعلیم حاصل کی۔

☆ آپؒ حضرت سندھیؒ کے نامور شاگرد اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔

☆ آپؒ کا انتقال مؤرخہ 10/دسمبر 2003ء کو حیدرآباد میں ہوا۔ نمازِ جنازہ مولانا عبدالصمد ہالیجی والوں نے پڑھائی۔ اور مقبرہ غلام شاہ کلہوڑو میں تدفین عمل میں آئی۔

اَللّٰھُمَّ اغفرہٗ و ارحمہٗ

تحریر

(مفتی) عبدالخالق آزاد

ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

☆☆☆☆

مقدمہ

سماجی عدل و انصاف؛ دین کا اہم تقاضا

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی ایک اہم تقریر

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم. قال اللّٰہ تعالیٰ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:61)

امابعد! حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری مدظلہ! نوجوانو اور بزرگو!

مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ آج میں آپ کے اس مختصر اجتماع میں حاضر ہوا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر مجھے چھیالیس سالہ پرانا دور یاد آتا ہے۔ کہ جب ہمارے استاد حضرت امام عبیداللہ سندھیؒ جمعہ کے روز اسی مقام پر (اشارہ کرتے ہوئے) اس ستون کے ساتھ تکیہ لگا کر یا کھڑے ہو کر ہمیں درس دیا کرتے تھے۔

حضرت سندھیؒ کا طریقہ تقریر و تفہیم

آپ تو نوجوان ہیں اور آپ نے بڑی زوردار تقریریں سنی ہیں، لیکن ہم نے اپنے شیخ اور استاد (حضرت سندھیؒ) کو دیکھا ہے کہ وہ بالکل سادہ الفاظ میں صاف اور آسان طریقے سے سمجھاتے ہوئے گفتگو کیا کرتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں دیہات میں سادہ سندھی لوگ رہتے ہیں۔ اور ان کی گفتگو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی آمیزش نہیں ہوتی۔ صاف سندھی زبان بولتے ہیں۔ بالکل اسی طرح حضرت شیخ اپنی تقریر میں غیرضروری فصاحت اور بلاغت سے کنارہ کشی فرماتے ہوئے صاف الفاظ اور آسان طریقہ استعمال فرماتے تھے۔ جیسے آج کل مقررین اپنی تقریر میں ظاہری تاثیر پیدا کرتے ہیں، اُن میں وہ بات نہ تھی۔ تاہم جو بات آپ فرماتے، وہ حکمت کی ہوتی تھی۔

نبوی طریقۂ تعلیم کی یاد

حضرت سندھیؒ کا وہ اندازِ حکمت دیکھ کر ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تدریس و تعلیم یاد آتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے سلسلے میں حدیث میں آتا ہے کہ: ''آپؐ کے الفاظ حکمت پر مبنی اور مختصر ہوتے تھے۔'' سننے والے اگرچہ اَن پڑھ تھے، مگر آپؐ کی بات کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ اور وہ فکرمند ہوتے تھے کہ حضورؐ کی ہر بات کو سنتے ہی اس پر عمل کریں۔ تو ہم نے نبوی طریقۂ تعلیم کو اپنے استاد حضرت سندھیؒ کے طریقۂ تعلیم میں پایا۔ سب سے پہلے جب یہاں (پیر جھنڈو میں حضرت سندھیؒ کا) درس شروع ہوا تو اس میں ملک کے مختلف علاقوں سے علمائے کرام شریک ہوئے۔ ریاست بہاولپور سے مولانا حافظ خلیل احمد صاحب تھے۔ میرے بزرگ دوست علامہ محمد کا کی پوٹہؒ، جو کہ علامہ اقبال مرحوم کے فلسفے میں استاد تھے، جو سندھ کے تھے۔ مولانا عبدالحق ربانی صاحب، نصرپوری کے تھے۔ میں تھا اور بہت سے علمائے کرام تھے۔

حضرت سندھیؒ کی سب سے پہلی تعلیم

ہمارے استاد حضرت سندھیؒ نے سب سے پہلے ہمیں جو تعلیم دی، وہ یہ آیت تھی، جو حضرت مولانا (سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ) نے اپنی تقریر کے شروع میں پڑھی۔ حضرت سندھیؒ کا پرگرام قرآن سے الگ تو تھا ہی نہیں، بلکہ قرآن ہی کا پروگرام ہے۔ تو حضرتؒ بھی یہی آیت اپنے پروگرام کے سلسلے میں پڑھا کرتے تھے۔ یعنی

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:61)

''اللہ وہ ہے، جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔ تاکہ اُسے دنیا کے دوسرے تمام ادیان اور نظاموں پر غالب کردے۔ اگرچہ مشرک اِسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد

حضرت سندھیؒ نے فرمایا کہ: سب سے پہلے مسلمان کو یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ

آپ ؐ کی بعثت کا مقصد کیا ہے؟ اور آپ ؐ پر جو قرآن نازل ہوا، وہ کیا حکم دیتا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ: حضرت امام الائمہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی کتاب "إزالة الخِفاء عن خِلافة الخُلَفاء" میں اس آیت کے تحت ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد شہنشاہیت اور سرمایہ داریت کو ختم کر کے عادلانہ نظام قائم کرنا ہے۔"

آپ لوگوں میں چوں کہ انقلاب کے سمجھنے کا جذبہ ہے، اس لحاظ سے مَیں حضرت مولانا سندھیؒ کی کچھ باتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ حضرت سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ اُس دور میں پوری دنیا پر دو سلاطین اور شہنشاہ قابض تھے: ایک کسریٰ اور دوسرا قیصر۔ پوری دنیا ان کے ماتحت تھی۔ حتیٰ کہ برعظیم (پاک و ہند) بھی کسریٰ کا باج گزار تھا۔ تو آپ ؐ کا مقصد اُس سرمایہ داریت کو ختم کرنا تھا، جو اس وقت شہنشاہیت کے روپ میں تھی۔ تو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے پہلے شہنشاہیت کو ختم کرنا ضروری تھا۔"

"حجۃ اللہ البالغۃ" میں شاہ صاحبؒ نے ان شهنشاهیتوں کی شاہ خرچیوں اور عیاشیوں کی پوری تصویر پیش کی ہے کہ کس طرح انھوں نے عوام پر بے دریغ ٹیکس لگا کر ان کی بُری حالت بنا دی۔ اور رات دن گدھوں کی طرح کام لے کر ایسا بدحال کر دیا کہ ان کو خدا بھی یاد نہیں رہا۔ تو گویا رسول اللہؐ کی بعثت خود عوام کے لیے رحمتِ خداوندی تھی۔ خود قرآن میں ہے کہ قرآن ہدایت ہے۔ تو آپ ؐ کو قرآن پاک دے کر شہنشاہیت کے خاتمے اور عادلانہ نظام کے قیام کے لیے بھیجا گیا۔

سیرتِ نبویؐ کا انقلابی پیغام

ہمارے سیرت بیان کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ آپ ؐ کا پہلا اعلان یہی تھا کہ میرے آنے کے بعد کسریٰ اور قیصر جو شہنشاہ ہیں، یہ ختم ہو جائیں گے۔ معنیٰ یہ ہے کہ یہ سرمایہ داری کی علامتیں ہیں۔ قیامت تک میری پارٹی اور میرے پروگرام کا اصل مقصد سرمایہ داری کو ختم کرنا ہے۔ جتنے بھی گناہ اور برائیاں جنم لیتی ہیں، سرمایہ داریت اور مال

کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

تنظیم و تربیت میں آپؐ کا اسوۂ حسنہ

آپؐ نے اس سرمایہ داریت کے خاتمے کے لیے ایک پارٹی بنائی۔ جس میں کثرت غربا کی تھی۔ مسکین اور بے نوا لوگ آگے بڑھے۔ آپ کی دعا تھی:

"اے اللہ! مجھے مسکین کر کے زندہ رکھ! مسکین کر کے مار! اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما!۔"

یہ لوگ حضورؐ سے ان کی تعلیم سیکھتے تھے، جو ہدایت پر مبنی تھی اور حکمت کی حامل ہوتی تھی۔ آپؐ کوئی (طویل) لیکچر نہیں دیتے تھے، بلکہ مختصر آیات ہوتی تھی۔ زیادہ تر لوگ عمل پر توجہ دیتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ انھوں نے سورۃ بقرہ کو سیکھنے میں کئی سال صَرف کر دیے۔ مطلب یہ تھا کہ جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے، آگے بڑھنا ٹھیک نہیں۔ یہ اسی نظم و ضبط پر مشتمل عمل اور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ 71 سال کے عرصے میں کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں مکمل طور پر ختم ہو گئیں۔ اور اللہ کا نظام رائج ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرح عمل کرنا بھی سکھایا۔

حضرت سندھیؒ کا مقصدِ زندگی

حضرت سندھیؒ نے فرمایا کہ: "ہمارا مقصد اسلام سکھانا ہے۔ وہ اسلام، جو سرمایہ داریت کو مٹانے آیا ہے۔ اور اسلام کی تعلیم صرف دو الفاظ پر محیط ہے۔" ہم نے حضرت سندھیؒ سے پوچھا کہ: حضرت! وہ دو الفاظ کون سے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا کہ: "**حجۃ اللہ البالغہ**" کی جلد اول میں دو بڑے مباحث ہیں: ایک "اقترابات" یعنی قربِ الٰہی، دوسرا "ارتفاقات" یعنی تعاونِ باہمی پر مبنی معیشت کا نظام۔ "اقترابات" کے ماتحت تمام عبادات کا بیان ہے۔ اس کے معنی ہوئے "خداپرستی"۔ اور "ارتفاقات" کے تحت وہ اصول ذکر کیے گئے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ زندگی کس طرح بسر کرے۔ یہ ہوئی "انسان دوستی"۔

میں نے "حجۃ اللہ البالغہ" کو "کارل مارکس" کی کتاب "داس کیپٹل" سے

مقابلہ کرتے ہوئے پڑھایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ''داس کیپٹل'' میں کئی ایسے سماجی اصول ہیں، جو کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "حجة الله البالغه" وغیرہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اگرچہ وہ دور کارخانوں کا نہیں تھا، لیکن پھر بھی "حجة الله البالغه" میں اس کے متعلق بہت کچھ اور کافی لکھا ہوا ہے۔ جہاں تک ولی اللٰہی تعلیم کا تعلق ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

حضرت سندھیؒ کی زندگی حضرت ابوذر غفاریؓ کا عملی نمونہ

بہرحال جہاں تک ہم نے دیکھا ہے تو حضرت سندھیؒ کی زندگی حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی کا عین نمونہ تھی۔ آپؒ کو مال اور سرمائے سے کبھی محبت نہیں رہی۔ اگر کوئی سائل آجاتا تو جتنے بھی پیسے موجود ہوتے، یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ کتنے ہیں، اٹھا کر یوں ہی دے دیا کرتے تھے۔ ہمیں خیال ہوتا تھا کہ لوگ آتے ہیں اور حضرتؒ سب کچھ دے دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ حضرتؒ کے پاس صرف ایک لباس ہوتا تھا۔ جو آپؒ کے جسم مبارک پر ہوتا تھا۔ اور وہ بھی صرف ایک کرتہ اور ایک پائجامہ، بس!۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ حضرتؒ کا کرتہ میں تبرک کے طور پر لے کر اپنے پاس رکھوں۔ مجھے معلوم تھا کہ کرتہ تو ایک ہی ہے، لہٰذا میں نے ایک نیا کرتا سلوا کر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ اور وہ کرتہ میں نے لے لیا۔ جو اَب تک میرے ہاں گھر میں محفوظ اور موجود ہے۔ یہ تھا سرمایہ داریت کے خلاف آپؒ کا عمل!۔ آپ سیرت کی کتابوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے عمل کو بھی دیکھیں! حضرت سندھیؒ کا عمل بالکل اسی طرح کا تھا۔

حضرت سندھیؒ کا توکل اور استغنا

ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (تب وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی، بعد میں صدر انڈیا) نے تار دے کر حضرت سندھیؒ کو دہلی بلوایا۔ میں نے آپؒ کے خادم اور رفیق مولانا عزیز احمد مرحوم برادر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے پوچھا کہ: حضرتؒ کے پاس پیسے ہیں؟ کہا: کچھ بھی نہیں۔ میں نے سعید آباد تک تانگے کا کرایہ دے کر حضرتؒ کا سامان رکھوایا۔ پانچ روپے کرایہ تھا۔ آپؒ اطمینان سے وہاں تشریف لے گئے۔ اسٹیشن پر ہم گاڑی

کے انتظار میں تھے۔ کوئی پیسہ پاس نہیں تھا۔ لیکن آپؒ کو کوئی فکر اور کسی قسم کی پریشانی کی کیفیت بھی نہیں تھی۔ اور گاڑی کے آنے کا وقت قریب ہو چکا تھا۔ عین اسی وقت ایک دیہاتی وہاں آیا۔ اور کہا: مجھے حضرتؒ کی آمد کی اطلاع ملی تو میں زیارت کے لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ وہ شہر میں اچانک آیا ہوا تھا۔ واپسی پر اُس نے جیب سے سکوں کی مٹھی بھر کر حضرت سندھیؒ کی خدمت میں پیش کی۔ جس سے سیکنڈ کلاس کی ٹکٹ خرید لی گئی۔

حضرت سندھیؒ کا پروگرام؛ خدا پرستی اور انسان دوستی

آپ لوگ یہ بات خیال میں رکھیں کہ حضرت سندھیؒ کے پروگرام کی اصل بات سرمایہ داریت کا خاتمہ تھی!۔ اس سلسلے میں حضرت سندھیؒ "سورۃ کوثر" بہت زیادہ تلاوت فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے "کوثر" کے معنی "خیر کثیر" کے بتلائے ہیں۔ اور آیت "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" (269:2) (جسے حکمت عطا کی گئی، اُسے خیر کثیر عطا کردی گئی۔) میں "الْحِكْمَةَ" کو "خَيْرًا كَثِيرًا" کہا گیا۔ پھر آپؒ نے تشریح فرمائی کہ سورۃ یٰسین کی آیت: "يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝" (36:2-1) میں قرآن کو "حکمت" کہا گیا ہے۔ تو سورۃ کوثر کی آیت: اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ (108:1) کے معنی یہ ہوئے کہ: "ہم نے آپ کو قرآن عطا کیا۔"

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ "الخیر الکثیر" میں فرماتے ہیں کہ: "آخرت میں قرآن کے فیض کی صورت حوضِ کوثر کی شکل میں ہوگی۔" جس نے یہاں قرآن سے جو فیض اور عمل حاصل کیا، وہاں اتنا ہی فیض اسے حوضِ کوثر سے ملے گا۔ اس سورۃ کوثر میں دو باتوں کا حکم ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ (108:2) (اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر) ایک نماز، جو خدا پرستی کا بڑا مظہر ہے۔ اور دوسری چیز اونٹ کی قربانی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اونٹ قربان کر کے وہ ایک آدمی تو سارا نہیں کھا سکتا، لامحالہ دوسروں کو کھلانا پڑے گا۔ اس کے معنی ہیں: انسانوں کے درمیان اشتراک اور تعاونِ باہمی ہونا چاہیے۔ اور یہ "انسان دوستی" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جتنی چیزیں رکھی ہیں، حق معیشت کے حوالے سے سب انسان ان میں مشترک ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے لکھا ہے کہ: "تمام چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں، انسان اس کا نائب ہے۔"

حضرت سندھیؒ سے متعلق ایک اہم واقعہ

بہرحال حضرت سندھیؒ کے متعلق اگر واقعات بیان کیے جائیں تو اس کے لیے بہت سا وقت چاہیے۔ اور اس کے لیے باقاعدہ درس ہونا چاہیے۔ تو ایک تیسری بات میں پیش کرتا ہوں۔ جو آپ نے کبھی نہیں سنی۔ میرے پاس چھپا ہوا کاغذ مدینہ طیبہ سے ایک شخص لائے۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ ایک شہادت اور دستاویز ہے۔ یہ کاغذ انھوں نے میرے شاگرد پروفیسر غلام حسین جلبانی صاحب کو بھی دیا۔ اس شخص نے بتایا کہ میں ملائشی ہوں۔ ملائشیا میں ضلع کلنتہ سے مولانا عبداللہ کلنتویؒ حضرت سندھیؒ سے پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے والد بہت بڑے عالم تھے۔ اور جیسے حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری (دامت برکاتہم العالیہ) اسلام کو صحیح طور پر نافذ کرنے اور صحیح اسلام سمجھانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور ان کو تڑپ لگی ہوئی ہے، اسی طرح ان مولانا عبداللہ کے والد کو بھی ایسی تڑپ لگی ہوئی تھی۔ اور میں دیکھ رہا ہوں جتنے نوجوان بھی یہاں بیٹھے ہیں، وہ اس تعلیم کے حصول کے لیے بے تاب ہیں۔ تو وہ بے چارے بھی بے تاب رہتے تھے۔

وہ عالم مسجدِ نبویؐ میں آئے اور گڑگڑا کے اللہ سے دعا مانگی۔ بہت روئے اور اسی حالت میں انھیں نیند آ گئی۔ خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ انھوں نے عرض کیا کہ: حضرت! میں پریشان ہوں۔ اس وقت دنیا میں صحیح اسلام سیکھنے کے لیے میں کس کے پاس جاؤں؟ تو آپؐ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اُس شخص کے پاس جا!'' اور ایک بزرگ کی شکل و صورت دکھائی۔ انھوں نے عرض کیا: حضرت! یہ بزرگ کہاں ہیں؟ فرمایا: ''مکہ مکرمہ حرمِ پاک میں ملیں گے۔'' نیند سے بیدار ہو کر فوراً وہ عالم وہاں سے چل پڑے اور مکہ مکرمہ میں پہنچے۔ دیکھا کہ واقعی جو شکل و صورت حضورؐ نے بتائی تھی، اس جیسا ایک شخص حرم پاک میں بیٹھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ: ''اسلام کا صحیح طریقہ اگر معلوم کرنا ہے تو اس بوڑھے سے معلوم کر۔ ایسی تعلیم کسی دوسری جگہ تمھیں نہیں ملے گی۔'' وہ عالم اِن بزرگ کے پاس آئے تو وہ حضرت سندھیؒ تھے، جو بیت اللہ میں تشریف فرما تھے۔ وہ حضرت سندھیؒ سے ملے اور کہا کہ: مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ کے ہاں بھیجا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: ''ہاں! مجھے معلوم ہے۔

آپ مزید کچھ نہ کہیں اور اصل بات بیان کریں۔" ہوسکتا ہے حضورؐ نے حضرت سندھیؒ کو بھی بتایا ہو کہ میرا مہمان آپ کے پاس آ رہا ہے۔

بہرحال اس عالم نے عرض کیا کہ: جو صحیح اسلام آپ سمجھا رہے ہیں، وہ مجھے بھی سکھائیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں، وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔ اور میں اُس کو صحیح معنی میں اسلام سمجھتا ہوں۔ اور اس طریقے پر اسلام کا سبق لینے والے دنیا میں یا تو کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا میں مسلمانوں کا تنزل ہے اور اسلام کی صحیح صورت موجود نہیں۔ بس سانپ کے نکل جانے پر اس کی لکیروں پر مارا ماری شروع ہے!۔ اسلام کی اصلی صورت اور اس کا پروگرام آج لوگوں سے چھوٹ گیا ہے۔

بہرحال اس عالم نے عرض کیا کہ: حضرت! میں تو آپ کی طرح بوڑھا ہوں۔ اب میں تو آپ کے پاس رہ کر پڑھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے میں اپنے اکلوتے بیٹے کو اس کام کے لیے وقف کرتا ہوں۔ تو انھوں نے ملائشیا میں جا کر اپنے بیٹے عبداللہ، جو کہ شافعی المذہب تھا، حضرتؒ کی خدمت میں روانہ کیا۔ حضرت سندھیؒ نے مولانا عبداللہ کلنتویؒ کو "حجة الله البالغه" اور دوسری کتابیں پڑھائیں۔ اور حنفی و شافعی مسلک میں تطبیق کا طریقہ سکھایا۔ مولانا عبداللہ کلنتویؒ کی ایک چھوٹی سی کتاب "مختصر الحديث"، جو کہ حضرت سندھیؒ کے فکر پر تھی، میں نے وہ آج سے دو سال پہلے شائع کی تھی۔

بہرحال وہ حضرت سندھیؒ سے پڑھ کر ملائشیا آئے۔ اور جس طرح حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری مدظلہ کوشش کر رہے ہیں، بالکل اسی طرح انھوں نے کوشش شروع کردی۔ اور وہاں فکرِ ولی اللّٰہی اور سیاستِ عبیداللّٰہی کے سلسلے میں ایک سکول قائم کیا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ تھوڑے عرصے بعد وہ جوانی میں ہی رحلت کر گئے۔ ان کے والد بہت روئے۔ لیکن بیٹے کے مرنے پر نہیں، بلکہ پروگرام کے منقطع ہونے پر۔ کہ جس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو وقف کردیا تھا، اور جن کے ذریعے سے مولانا سندھیؒ کے واسطے سے شاہ ولی اللہؒ کی جو تعلیم لوگوں کو پہنچ رہی تھی، وہ ہستی تو چل بسی۔ شاید اس کام کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ یہ پورا واقعہ عربی میں اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ وہ کاغذ اور

دستاویز میرے ہاں موجود ہے۔ کسی کو ضرورت ہو تو میں اسے فوٹو کاپی دے سکتا ہوں۔

حضرت رائے پوری کی جدوجہد سے خوشی ہوئی

میں نے کافی کوشش اور محنت سے شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو پڑھا اور پڑھایا ہے۔ سندھ کے دو تہائی علما میرے شاگرد ہیں یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ میں اب بھی فلسفہ ولی اللٰہی کی تعلیم دیتا رہتا ہوں۔ اور لوگ مجھ سے پڑھتے رہتے ہیں۔ میں آپ کے متعلق سنتا تھا کہ آپ کے ہاں بڑا جذبہ ہے۔ اور حضرت سندھیؒ کی تحریک پر کام کر رہے ہیں۔ اور مولانا سعید احمد صاحب (رائے پوری مدظلہ) کے متعلق بھی مجھے علم تھا، پہلے بھی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔

اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ تھوڑے بھی ہوں تو بھی آپ اپنے آپ کو تھوڑے نہ سمجھیں۔ آپ اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھیں۔ جو انقلابی ہوتا ہے، اس کی بات فطری طور پر خود بخود پہنچ جاتی ہے۔ آپ سورہ یٰسین پڑھیں۔ حضورؐ کی تعلیم فطرت کے عین مطابق تھی۔ جب مکہ کے لوگوں نے نہیں مانا اور ان میں شور تھا تو مدینہ کے لوگوں نے اس کو قبول کرلیا۔ قرآن کی تعلیم فطری ہے۔ اگر یہاں کے لوگ قبول نہیں کرتے تو دوسرے لوگ آئیں گے، وہ قبول کرلیں گے۔ اگرچہ آپ بظاہر کمزور ہیں، لیکن ایک انقلابی آدمی سے تمام سامراجی اور سرمایہ دار قوتیں و طاقتیں ڈرتی ہیں۔ اس لحاظ سے میں آپ کو مبارک دیتا ہوں۔

میرا علمی تعاون آپ کے ساتھ رہے گا

جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے اور میرے پاس جو علمی چیزیں ہیں، حضرت سندھیؒ یا ولی اللٰہی فکر کی ہیں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ میں **تحدیث بالنعمۃ** (اللہ کی نعمت کی شکریے) کے طور پر کہتا ہوں کہ جہاں تک اسلام کی تعبیر کا تعلق ہے تو بڑے سے بڑا عالم آپ کو اس طرح نہیں سمجھائے گا اور آپ نوجوانوں کو مطمئن نہیں کرسکے گا، جیسا کہ میں اس بڑھاپے کی حالت میں کرسکتا ہوں، انشاء اللہ!۔ اب میری عمر **76** ویں سال میں داخل ہوئی ہے۔ اور دل کا مریض ہوں۔ مجھے اپنے شیخ حضرت سندھیؒ کا واقعہ یاد ہے کہ آپؒ نے ہمیں اور مولانا دین محمد وفائیؒ کو ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اس مرض نے میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اب میں تحریک کا کام کھڑے ہو کر تو نہیں کر سکتا، البتہ بیٹھے بیٹھے آپ لوگوں کو سمجھاؤں گا۔''

آپ آگے بڑھیں تو میں بھی اپنے استاد اور شیخ حضرت سندھیؒ کے وہی الفاظ دہراتا ہوں کہ اگر آپ مجھ سے کوئی مشورہ لیں گے یا کوئی چیز معلوم کریں گے تو میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

ہمارا انقلاب لادینی نہیں، دینی ہے

آپ نوجوان ہیں اور انقلاب لا سکتے ہیں۔ اور ہمارا انقلاب لادینی نہیں، دینی ہے۔ ہم صحیح معنی میں قرآن کا انقلاب اور اس کا فکر لانا چاہتے ہیں۔ آپ بہرحال اس لحاظ سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری ہمدردیاں بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ دو رسالے ''الرحیم'' اور ''الولی'' شائع ہوتے ہیں۔ اگر آپ کوئی اردو یا سندھی میں مضمون روانہ کریں تو ہم وہ شائع کریں گے۔ وہ رسالے حضرت مولانا سندھیؒ کے فکر کے ہیں اور ہم ''شاہ ولی اللہ اکیڈمی'' کی طرف سے انھیں چھاپتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کوئی جس قسم کی ضرورت ہو تو آپ کے ساتھ ہمارا تعاون ہے۔

ضعف کی وجہ سے زیادہ دیر میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جو باتیں سنائی ہیں، وہ آپ لوگوں کی دعا کی برکت ہے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی کوئی ایسا موقع آئے یا کوئی ایسا آپ اجتماع رکھیں تو میں اس میں خاص طور پر حضرت سندھیؒ کی باتیں عرض کروں گا۔

و آخر دعوانا اَنِ الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین!



فصل اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے فکر و فلسفے کی جامعیت

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کا عہد

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی ولادت بروز چہار شنبہ (بدھ) 04/ شوال المکرم 1114ھ بمطابق 21/فروری 1703ء ہوئی۔ (اور آپؒ کا انتقال 29/ محرم 1176ھ مطابق 21/اگست 1762ء کو ہوا۔)

عالمی تاریخ کے ارتقا میں آپؒ کا ظہور کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ قدرت کی طرف سے اسلام جیسے بین الاقوامی دین کی صحیح تعبیر اور امتِ محمدیہؐ کے مختلف فرقوں میں جو افتراق اور تشتت (انتشار) پیدا ہوگیا تھا، اس کی اصلاح اور سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت جو لوٹ کھسوٹ ہوتی تھی، اسے دور کرنے کے لیے قدرت نے آپؒ کو منتخب کیا۔

شاہ صاحبؒ کی نسبی حیثیت

شاہ صاحبؒ کا مختصر نسب نامہ اس طرح ہے:

قطب الدین ولی اللہ (1) احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین شہید بن معظم بن منصور بن احمد العمری۔

اس طرح یہ سلسلۂ نسب، اسلام کے عظیم فاتح اور عادل خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی تحقیقات کی اہمیت

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ابن تیمیہؒ اور ابن رُشدؒ کے بعد، بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزّل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں، جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا نام وَر شخص پیدا ہوا۔ جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالیؒ، رازیؒ، اور ابن رُشدؒ کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔''(2)

شاہ صاحبؒ کے والدِ گرامی کی علمی اہمیت

شاہ صاحبؒ کو قدرت کی طرف سے جو علمی اور عملی صلاحیتیں ودیعت ہوئیں تھیں، ان کی نشوونما کے لیے ماحول کی سعادت اور موافقت کافی حد تک دخیل تھی۔ آپ کے والدِ ماجد شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ نے علوم اور معارف کی تحصیل عالم گیری دور کے علما و صلحا اور اسلامی سوسائٹی سے کی تھی۔ اور ان کو خصوصی معارف، ان کے نانا شیخ رفیع الدین دہلویؒ سے ملے تھے۔ شیخ رفیع الدین دہلویؒ نے طریقت کا اکتساب اپنے والد بحرِ موّاج قطب عالم سے کیا تھا۔ وہ اپنے والد بزرگوار امام عبدالعزیز بن حسن دہلویؒ سے مستفیض ہوئے تھے۔ جنھوں نے اپنے والد حضرت شیخ کمال الدین حسن بن طاہر دہلویؒ سے اکتساب کیا تھا۔ آخر الذکر بزرگ کی وفات 909ھ(1503ء) میں ہوئی۔(3)

شاہ صاحبؒ کے عہد کے سلاطین

شاہ صاحبؒ کو اپنی زندگی میں دس سلاطین دہلی کی حکومت دیکھنے کا اتفاق ہوا:

1۔ اورنگ زیب عالم گیر اعظم (1114ھ/ 1703ء - 1118ھ/ 1707ء)

2۔ محمد معظم المعروف بہادر شاہ اوّل (1118ھ/ 1707ء - 1124ھ/ 1712ء)

3۔ مُعِزّ الدّین جہاں دار شاہ (1124ھ/ 1712ء - 1125ھ/ 1713ء)

4۔ جلال الدین فرخ سیر (1125ھ/ 1713ء - 1131ھ/ 1719ء)

5۔ محمد ابو البرکات رفیع الدرجات (1131ھ/ 1719ء - تین ماہ، گیارہ دن)
6۔ شمس الدین رفیع الدولہ (1131ھ/ 1719ء - تین ماہ، اٹھائیس دن)
7۔ روشن اختر ابوالفتح محمد شاہ (1131ھ/ 1719ء - 1161ھ/ 1748ء)
8۔ مجاہد الدین ابوالنصر احمد شاہ (1161ھ/ 1748ء - 1167ھ/ 1754ء)
9۔ عزیز الدین عالم گیر ثانی (1167ھ/ 1754ء - 1173ھ/ 1759ء)
10۔ شاہ عالم ثانی (1173ھ/ 1759ء - 1221ھ/1806ء)

شاہ عالم ثانی کے عہد میں شاہ صاحبؒ کی وفات سے تقریباً دو سال قبل (1174ھ/ 1761ء) (لارڈ) کلائیو نے الہٰ آباد کے مقام پر بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی بادشاہ سے لے کر کمپنی بہادر کے حوالے کی۔

حضرت استاد علامہ عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مذکورہ بالا سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو کن کن لرزہ خیز واقعات و حوادث سے گزرنا پڑا۔ ساداتِ بارہہ کا تسلط۔ فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بے کسی قید ہونا۔ پھر تورانی امرا کے ہاتھوں ساداتِ بارہہ کا زوال۔ مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج۔ سکھوں کی بغاوت۔ نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتلِ عام۔ احمد شاہ ابدالی اور معرکۂ پانی پت میں حق کا باطل پر غلبہ۔ سیاستِ ہند میں روہیلوں کی شرکت و مساہمت (حصے داری)۔ ایرانی و تورانی اُمرا کی رقیبانہ چپقلش۔ ہندوستان میں یورپین اقوام کی للچائی ہوئی نگاہیں۔ پھر انگریزوں کا بنگال وغیرہ میں عمل دخل اور اسی قسم کے دوسرے انقلاباتِ شاہ صاحبؒ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔'' (4)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جس تحقیق اور تجدید کے داعی تھے، اس کی تخم ریزی آپؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی طرف سے ہوئی تھی۔ جس کی آب یاری شاہ صاحبؒ نے کی۔ (5)

ولی اللّٰہی دعوت کے چار اصول

(مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ''التمہید'' میں لکھا ہے کہ) ولی اللّٰہی دعوت کا اگر صحیح تجزیہ

کیا جائے تو اس کے بنیادی اصول چار (6) معلوم ہوتے ہیں:

اوّل: قرآن حکیم میں براہِ راست غور وفکر اور تدبر

1۔ سب سے پہلے قرآنِ پاک پر غور کرنا اور مفسرین کے ذاتی آرا اور خیالات کو چھوڑ کر (براہِ راست) قرآن سے ہدایت حاصل کرنا۔ شاہ صاحبؒ نے اس تدبُّر کے چند اصول، اپنی مخصوص تالیف ''الفوز الکبیر'' میں بیان فرمائے ہیں۔

دوم: احادیثِ نبویہؐ کے فہم میں محققانہ طرزِ فکر وعمل

2۔ احادیثِ نبویہؐ کے سلسلے میں تحقیقی مقام تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کے عمل کو آسان بنانا۔ اور صریح احادیث اور معروف سنت کے موافق جو مذاہب ہیں، انھیں اختیار کرنا۔ یہ ملکہ حضرت شیخ عبدالرحیم دہلویؒ میں اجمالی طور پر موجود تھا۔ اسی سے امام ولی اللہ دہلویؒ متأثر ہوئے۔

سوم: تصوف اور علوم دینیہ میں جمع وتطبیق

3۔ علم اور تصوف میں جمع وتطبیق۔ یہ کام بھی حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے شیخ اور والدِ گرامی شیخ ابوالفیض عبدالرحیم بن وجیہ الحق والدین کی برکت سے کیا۔ شیخ عبدالرحیم دہلویؒ نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے طریقے کے پانچ بنیادی اُصول ہیں:

(الف) ہمیشہ ذکر اللہ میں مشغول رہنا۔

(ب) ہر حالت میں تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنا۔

(ج) بغیر کسی تفریق کے تمام مخلوق کو نفع پہنچانا۔

(د) اللہ کی کسی بھی مخلوق سے اپنے آپ کو افضل نہ سمجھنا۔

(ہ) اللہ کے حکم اور اللہ کی مخلوق کے سامنے تواضع اختیار کرنا۔'' (7)

چہارم: سماجی حکمتِ عملی اور علوم شرعیہ میں جمع وتطبیق

4۔ سماجی حکمتِ عملی کی تمام اقسام (یعنی تمام ارتفاقات):

(الف) (ارتفاقِ اول) تہذیب الاخلاق۔ اَخلاق کی درستگی۔

(ب) (ارتفاقِ دوم) تدبیر منزل۔ گھریلو زندگی کا نظام۔
(ج) (ارتفاقِ سوم) سیاستِ مدنیہ۔ قومی سطح کا سیاسی اور معاشی نظام۔
(د) (ارتفاقِ چہارم) سیاستِ مدن۔ بین الاقوامی سطح کا نظام۔
اور علومِ شرعیہ کے درمیان جمع و تطبیق پیدا کرنا۔

چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ "بوارق المعرفت" میں لکھتے ہیں:
"اس فقیر نے حضرت والد صاحب قدس سرّہ کی مجلسِ صحبت سے حکمتِ عملی اور معاملات کے آداب بہت زیادہ سیکھے۔" (8)

اور "الجزء اللطیف" میں لکھا ہے:
"انھوں نے مجھے اپنی تمام تر وسعت کے ساتھ حکمتِ عملی کے فوائد سمجھائے کہ اس دور کی تمام تر اصلاح اور درستگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اور پھر اس کو کتاب وسنت اور آثارِ صحابہؓ کے ساتھ مضبوط بنانے کی توفیق دی۔" (9)

قرآن مجید میں تدبُّر کی اہمیت

شاہ صاحبؒ نے قرآنِ مجید کے باتدبر مطالعہ کو ایک سنتِ لازمہ قرار دیا تھا۔ قرآنِ مجید کے فارسی ترجمہ اور فوائد فتح الرحمٰن (مختصر تفسیری حواشی) کو اسی تدبر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ آپؒ کے بعد آپ کے فرزندانِ گرامی شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، تینوں نے اپنے والد بزرگوار کی پیروی میں قرآنِ کریم کی بڑی خدمت کی۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر "فتح العزیز" لکھ کر قرآنِ عظیم میں تدبر اور غور وخوض کرنا اور آیاتِ قرآنی کو اپنے دور کے لوگوں کے حالات پر چسپاں کرنے کے لیے ایک عمدہ نمونہ پیش فرمایا۔ آگے چل کر ولی اللّٰہی جماعت میں سے مولانا شیخ الہند محمود حسنؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے "موضح القرآن" کی اس طرح اصلاح فرمائی کہ اردو کے متروک الفاظ کی جگہ مستعمل الفاظ رکھے۔ اور اس کا نام "موضح الفرقان" رکھا۔ (10)

قرآن مجید کی تعلیمات میں اجتماعیت کی اہمیت

قرآنِ مجید میں تدبر کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے اصولوں کو اگر نظر

غائر سے دیکھا جائے تو ان سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ قرآنِ مجید کی تعلیمات میں اجتماعی روح اور اجتماعیت کو بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ شاہ صاحب نے کھل کر فرد کے مقابلے میں اجتماع، اور انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت کو بہت زیادہ نمایاں نہیں کیا۔ جس کا باعث یہ ہے کہ اس دور میں جو ملکی حالت تھی، وہ اس قسم کے افکار کی اشاعت اور علانیہ تائید کی متحمل نہ تھی۔ کیوں کہ وہ بادشاہوں کا دور تھا۔ اور بادشاہی دور میں فرد ہی طاقت کا محور رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے قرآنِ مجید کے نُزول کے اصلی مقصد ''سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح، عادلانہ نظام کا قیام اور فاسد اجتماعیت کی جگہ صالح اجتماعیت کو پیدا کرنا'' قرار دیا۔ چناں چہ قرآنِ حکیم کے پڑھنے میں اجتماعیت پر سوچنے اور غور وخوض کرنے کی دعوت دی۔

عہدِ نبویؐ میں استعماری نظاموں کا خاتمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں دنیا کے مہذب ممالک دو سلاطین کے زیرِ نگیں معلوم ہوتے ہیں:

1۔ ایک کسریٰ، شہنشاہِ ایران۔

2۔ دوم قیصرِ روم۔

عراق، یمن، خُراسان اور ان کے متصل ممالک بھی کسریٰ کے زیرِ اقتدار تھے۔ ماوراء النہر (بخارا، سمرقند، تاشقند وغیرہ) اور ہندوستان کے سلاطین اور حکمران بھی کسریٰ کے باج گزار تھے۔ ہر سال ان ممالک سے لگان کا ایک مقرر حصہ، کسریٰ کی طرف سے وصول کیا جاتا تھا۔ روم اور اس کے نواحی ممالک پر قیصر کا تسلط تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے سلاطین، قیصرِ روم کے تابع تھے۔ کسریٰ اور قیصر دونوں شہنشاہوں کا نظام سرمایہ دارانہ تھا۔ اور ان دونوں فرماں رواؤں کو شکست دے کر ان کے ممالک پر قبضہ کرنا، روئے زمین پر قبضہ کرنے کے مترادف تھا۔

اس لیے پیغمبر علیہ السلام نے مبعوث ہوتے ہی یہ اعلان فرما دیا:

''هلک کسریٰ، ثمّ لا یکون کسریٰ بعدهٗ، و قیصر لیهلکنّ، ثمّ لا یکون قیصر بعدهٗ، و لتقسمنّ کنوزهما فی

سبیل اللّٰہ.(11)

''کسریٰ ہلاک ہوگا پھر اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ اور قیصر ضرور ہلاک ہوگا اور پھر اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔ اور ضرور بالضرور ان دونوں کے خزانے اللہ کے راستے میں تقسیم ہوں گے۔''

اس طرح گویا آپؐ نے سرمایہ داری نظام کے خاتمے کا اعلان فرمادیا۔

قیصر و کسریٰ کے بارے میں شاہ صاحبؒ کا تجزیہ

''حجۃ اللہ البالغہ'' میں ایک جگہ شاہ صاحبؒ اہلِ فارس اور اہلِ روما کی عیاشانہ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تاریخ شاہد ہے کہ اہلِ رُوما اور اہلِ فارس (ایران) میں ایک لمبی مدت تک حکومت رہی۔ انھوں نے اپنے دور کے حالات کے مطابق تمدن کے لوازم اور رفاہیت (آرام پرستی) اور عیاشانہ زندگی میں غیر معمولی ترقی کی۔ آخرت کی یاد کو پس پشت ڈال کر اپنی دنیوی زندگی کو عیاشی کے ساتھ بسر کرنا، اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور شیطان نے ان پر اپنا پورا تسلط جمالیا۔ اور اطرافِ عالم سے مُوجِد اور مُختَرِع (نئی نئی ایجادات کرنے والے کاری گر) کھنچ کر وہاں چلے آئے۔ اور زندگی کی لذتوں کے متعلق کئی ایک نئی چیزیں اور نئے طریقے دریافت کیے۔ تمام امرا اور سرمایہ دار عیش پرستی میں منہمک تھے۔ اور اس بارے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ ان عیش پرست اور خود پسند اُمرا میں، جس کا کمر بند ایک ہزار روپے سے کم قیمت کا ہوتا تھا، اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر سرمایہ دار اور امیر کبیر کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس ایک شان دار محل ہو۔ جس کے صحن کے سامنے باغ ہو۔ حمام وغیرہ جیسے لوازم اس میں موجود ہوں۔ اس کے دسترخوان پر اَلوانِ نعمت (قسم قسم کے کھانے) چنے جائیں۔ اور اس کی زرق برق پوشاک، سب لوگوں میں نمایاں ہو۔ نیز اس کے پاس عمدہ نسل کے گھوڑوں اور راحت بخش گاڑیوں کی کمی نہ ہو۔ اور خدمت کے لیے لونڈیاں اور کمر بستہ غلام حاضر باش رہا

کریں۔'' (12)

قیصر و کسریٰ کے تناظر میں ہندوستان کے ظالمانہ نظام کا تجزیہ

شاہ صاحبؒ اپنے دور کے سلاطین اور والیانِ ریاست کی مثال دے کر اہلِ روما اور اہلِ فارس (ایران) کی حالت اس طرح سمجھاتے ہیں:

''عصر حاضر کے ملوک و سلاطین اور والیانِ ریاست کے ٹھاٹھ دیکھ کر تم ان کی عیاشیوں اور زندگی کے مرافق میں غلو اور حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ عیش پرستی کا یہ طریقہ ان کے رَگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام تمدن اور معاشرے میں ایک لاعلاج روگ پیدا ہو گیا۔ دوسرے سب لوگ ان کی دیکھا دیکھی عیاشیوں پر مائل ہو گئے۔ کیوں کہ یہ ایک سچا مقولہ ہے۔ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ'' یعنی عوام اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں''۔ رعیت کے ہر طبقے میں اپنی حیثیت کے موافق عیاشی کا مرض پھیل گیا۔ اور اس نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی۔ اس عیاشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ قسم قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کیوں کہ عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی، اس کا حاصل ہونا، بہت سی دولت خرچ کرنے کے بغیر ناممکن تھا۔ اسی لیے ان ملوک و سلاطین نے اپنی رعیت اور بیوپاریوں پر، امرا نے اپنی اسامیوں پر بھاری بھاری لگان (ٹیکس) عائد کیے۔ اس حالت میں ان غریبوں کے لیے دو ہی راہیں تھیں: ایک تو یہ کہ بغاوت کا علم بلند کریں۔ اور مسلح ہو کر مقابلہ کریں۔ ایسا کرنا تو ان کے امکان سے باہر تھا۔ کیوں کہ یہ لوگ بے سروسامان تھے۔ ان کے سامنے دوسرا راستہ یہ تھا کہ سلاطین اور سرمایہ داروں کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ چوپایوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کریں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے، کہ ا[illegible]ں کی اپنی اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔

بہرحال نچلے طبقے کے لوگ اپنے عمال اور اپنے آقاؤں کی خدمت میں اس

قدر مشغول ہوتے تھے کہ ان کو اُخروی سعادت کی طرف متوجہ ہونے کی لحہ بھر بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

اس عیاشانہ نظام (اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی زندگی) کو قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا، کہ اس قسم کے لوگ موجود ہوں، جو ان کے لیے مختلف قسم کے کھانے تیار کریں۔ ان کے لیے مختلف طرح کے کپڑے اور زینت و آرائش کا سامان بنائیں۔ اور ان کے لیے بڑے بڑے شان دار محلات اور مکانات تعمیر کریں۔ لوگوں کی اکثر تعداد تو ان بے سود اَشغال میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے ایسے ضروری ہنر اور پیشے چھوڑ دیے گئے، جن کا ہونا اصل تمدُّن کے لیے نہایت ضروری تھا۔

جن لوگوں کا امرا اور سرمایہ داروں سے تعلق تھا، ان کے دلوں میں بھی یہ شوق پیدا ہوگیا تھا کہ وہ بھی ان سرمایہ داروں سے ملتی جلتی طرزِ معاشرت اختیار کریں۔ سب کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح حکومت سے وابستہ ہوں۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو حکومت کے خزانے سے کچھ پا کر اپنی زندگی بسر کریں۔ اس لیے ان کی اکثریت نے تو سرکاری ملازمت کو ہی اپنا مقصد قرار دے دیا تھا۔ اور اس ملازمت کو ہی منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات نہ ہوتی تھی کہ حکومت کا نظام ٹھیک طور پر کام کرے۔ اور تمدن کو کسی بہتر معیار پر رکھا جائے۔ ان کا نصب العین صرف جلبِ زر (مال لوٹنا) ہوتا تھا۔ ان میں بعض شعر گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیتے تھے اور مدحیہ قصائد لکھ کر سرکاری خزانے کے لیے بارِ گراں (بھاری بوجھ) ثابت ہوتے تھے۔ بعض لوگ زہد اور پارسائی کے دکھاوے سے حکومت، سرکاری ملازموں اور عام لوگوں سے نذرانے اور شکرانے وصول کرنے کا دام بچھاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ جماعت بھی حکومت اور معاشرے پر بوجھ ڈالتی تھی۔ ملوک وسلاطین اور اَربابِ اقتدار سے قرب حاصل کرنے اور طرح طرح سے ان کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے نے ایک ہمہ گیر وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔

خلاصہ یہ کہ جب یہ مرض اپنی انتہائی شدت کو پہنچ گیا، تو اللہ تعالیٰ ان پر سخت ناراض ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت نے عوام کی حالتِ زار کو دیکھ کر یہ تقاضا کیا کہ سرمایہ داری اور عیاشی کے اس مرض کی بیخ کنی کی جائے۔ چناں چہ اس نے نبی اُمی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے مذکورہ عیاشانہ زندگی کی قباحت اور بُرائی بیان فرمائی۔ سرمایہ دارانہ زندگی کے لوازمات سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ مثال کے طور پر ریشمی کپڑے پہننے، سونے چاندی کے برتن کھانے پینے کے کام میں لانے، مردوں کا عورتوں کی طرح اپنے آپ کو زیورات سے آراستہ کرنے، شان دار عمارتیں بنوانے اور پھر ان کی آرائش کے لیے رنگین پردے اور تصویریں لٹکانے کو ممنوع قرار دیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی اُمت اور اپنے پیروکاروں کو پہلے سے بتا دیا کہ آپؐ کا غلبہ (سرمایہ دار) سلاطین کی دولت و حکومت کے زوال کا باعث ہے۔ اور آپؐ کی نبوت کا مقصد کسریٰ اور قیصر (جیسے شہنشاہوں) کی سلطنتوں کو مٹا دینا ہے۔

بہر حال اس دور میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ عوام کی اصلاحِ احوال کی جائے۔ اور ان کی معاشی حالت کو درست کر کے، معاشرے کو خوش حال بنایا جائے۔ اور اس کام کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی جماعت پیدا ہو، جو ان کو نیکی کا حکم کرتی رہے۔ اور برائی سے اُن کو روکے۔ اور ان کی حالتِ زار میں انقلابی طور پر تبدیلی پیدا کرے۔ یہ انقلابی تبدیلی اسی صورت میں ممکن تھی کہ کسریٰ اور قیصر جیسے دو عظیم شہنشاہوں کی مستبد حکومتوں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ان کی جگہ معاشی مساوات، انسان دوستی اور خدا پرستی پر مبنی صحت مند نظام قائم کیا جائے۔

پیغمبر علیہ السلام کو خدائے پاک نے مبعوث فرمایا۔ اور انھیں یہ بشارت دی کہ کسریٰ اور قیصر کا اقتدار ختم ہوگیا۔ جس کی یہ صورت ہوگی کہ پہلے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعے عرب میں انقلاب بپا ہوگا۔ اور پھر آپؐ کی تربیت یافتہ جماعت مہاجرین و انصار کے ذریعے ان دونوں حکومتوں کو ختم کر کے عالمی انقلاب برپا ہوگا۔" (13)

مقصد نزولِ قرآن

شاہ صاحبؒ نے مذکورہ بالا انقلاب کو نزولِ قرآن کا مقصد قرار دینے کے بعد معاشی ناانصافی اور عدمِ مساوات کی برائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ (مرض) پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔'' شاہ صاحبؒ یہ بھی مانتے ہیں کہ: ''جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر و کسریٰ نے متمدن دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا اور مشیتِ الٰہی نے اس فاسد نظام کو ختم کرنا چاہا تھا، اسی طرح ان کے زمانے میں معاشرہ بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اور اس کا مٹنا بھی یقیناً نظر آتا تھا۔'' (14)

شاہ صاحبؒ کے انقلابی پروگرام کا اہم اصول اور جامع فلسفہ

شاہ صاحبؒ کے اصلاحی اور انقلابی پروگرام کا اہم اصول: ''اقتصادیات میں توازُن اور معاشیات میں مساوات'' کو واضح کرنا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازُن ایک ضروری امر ہے۔ اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے۔ زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں، لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات بھی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے انسان کی جدوجہد، اس کی حیوانی ضرورتوں تک محدود ہو جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازِن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ دنیاوی میں انسانیت کے اجتماعی اَخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''انسانیت کے اجتماعی اَخلاق اس وقت برباد ہوجاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام فرماتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قُدرتِ الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے''۔ (15)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ہر معاشی نظام کی بنیاد کسی نہ کسی فلسفے پر رکھی گئی ہے، تو کیا شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنی تالیفات میں جو عادلانہ تقسیمِ مال و دولت اور مساویانہ نظام پر زور دیتے ہیں، اس نظام کے لیے کوئی فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک شاہ صاحبؒ نے ایک جامع فلسفہ بھی پیش کیا ہے۔ لیکن یہ فلسفہ کارل مارکس کے فلسفے اور سرمایہ داری نظام کی فلاسفی کی طرح اختراعی (گھڑا ہوا) نہیں ہے۔ بلکہ حقائقِ کائنات کے تناظر میں مرتب اور مدوّن کیا گیا ہے۔

فلسفے کی سیاسی اور سماجی اہمیت

سیاسی قوت (Political Power) اجتماعی قوت (Social Power) سے پیدا ہوتی ہے۔ اور معاشرتی طاقت (Social Power) کا مدار کسی نہ کسی فلسفے (Philosophy) پر ہوتا ہے۔ جس معاشرے کا فلسفہ اعلیٰ ہوگا، اس کی ذہنی قوتیں اس اعلیٰ فلسفہ کی بدولت کبھی نہ کبھی درجۂ کمال تک پہنچ جائیں گی۔ اور اس کی معاشرتی اور اقتصادی حالت بھی اچھی ہوگی۔ کیوں کہ ذہنی قوتوں کا اثر معاشرت اور اقتصاد پر پڑتا ہے۔ اگر سماجی حالت (جو کہ ذہنی قوتوں کی پیداوار ہے) اچھی ہوگی، تو اس سے جو سیاسی قوت پیدا ہوگی وہ بھی اچھی کہلائے گی۔

فلسفے کی حقیقت و ماہیت اور تعریف

اصل میں فلسفہ نام ہے ذہنی تبدیلی کا۔ جب تک ذہن کو ایک طرف نہ لگایا جائے تو معاشرتی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ عقل کے سامنے ایک چیز بطورِ مرکزی

تصور کے پیش کی جائے۔ اور باقی سب چیزیں اس کے ساتھ وابستہ کردی جائیں۔ (16)

قرآنِ مجید نے اس مرکزی نقطے کو ہر جگہ بیان فرمایا ہے۔ اور سورۂ اخلاص میں اس وحدتِ مرکزیہ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا، وہ "احد" یعنی ایک ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور دوسری صفت "صمد" ہے۔

حضرت استاذ علامہ عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں:

"صمد" اُسے کہتے ہیں، جس کی تمام چیزیں محتاج ہوں۔ اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔..... ہمارا خیال یہ ہے کہ یونانی فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ (یعنی "حقیقتِ قصویٰ" یا "ذاتِ باری") کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا عربی ترجمہ "واجب الوجود" ہے۔ یعنی جس کی ہستی دوسرے کی محتاج نہیں، بلکہ وہ ازخود موجود ہے۔ اسی طرح ایرانی فلاسفہ کا لفظ ہے: "خدا" یعنی خود آمدہ (از خود موجود ہونے والا)۔ اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے قرآنِ مجید میں "صمد" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فلسفیانہ طور پر اس کا ترجمہ "واجب الوجود" ہے۔" (17)

شاہ ولی اللہؒ کے فلسفے کی جامعیت

شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی بنیاد مذہبِ اسلام کی حکمت اور اس کی روح پر ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک سب سے پہلے انسان کے لیے "ارتفاقات" کی بہتری کی بنیاد پر معاشی خوش حالی کا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان کو ذہنی سکون ملتا ہے، تو اس کے بعد وہ مذہب اور اَخلاق کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور انسانیت کے بنیادی "اَخلاق" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جس کی حقیقی علت یہ ہے کہ جب تک انسان انسانیت کے اس اولین مرتبے یا درجے کو طے نہیں کرتا، اس وقت تک وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوکر انسانیت کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ شریعت اور اَخلاق کی ذمہ داری انسانوں پر عائد ہوتی ہے، حیوانوں پر نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ یہ کارل مارکس کے مادی فلسفے سے مشابہت رکھتا ہے۔ کارل مارکس بھی اَخلاقی اصول اور مذہبی احکام کو معاشی ضروریات کے تابع قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اخلاقی اصولوں اور معاشی تقاضوں میں باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے تو اَخلاق و

مذہب کو اپنی شکست مان کر معاشیات کا غلبہ ماننا پڑتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشیات کے متعلق شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے اصولوں کی بنیاد قرآنِ حکیم کی حکیمانہ تعلیم اور اس کی عملی شکل پیغمبر علیہ السلام کی سنت پر ہے۔ اس لیے فلسفہ ولی اللّٰہی میں معاشی ضروریات اور مذہب و اخلاق کے متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ نے اسلام کی تعبیر دو لفظوں ''اقتراب'' اور ''ارتفاق'' سے فرمائی ہے۔ خدا پرستی اور انسان دوستی کو انسانیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ انسان دوستی کی صحیح تعبیر مال و دولت کی مساویانہ تقسیم ہے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ معاشرے میں ایک تو عظیم سرمایہ دار بن جائے اور دوسرے کو کھانے کے لیے روٹی اور اوڑھنے کے لیے کپڑا بھی میسر نہ ہو۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ فرد کے مقابلے میں اجتماعیت پر زور دیتے ہیں۔

ولی اللّٰہی فکر کی اساس: ایک جامع فلسفہ

شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں جملہ کائنات فی الحقیقت ایک وحدت ہے، جس کا نام ان کے فلسفے میں ''شخصِ اکبر'' ہے۔ (18)

شخصِ اکبر (کائنات کا عالم گیر ڈھانچہ)

جسمانی عالم کو جو کتنا ہی طویل و عریض ہو، اُسے ایک ہی جسم ماننا چاہیے۔ یہ سارا جسم خود ایک مستقل چیز ہے۔ اور اس کے اندر مختلف جسم ایسے ہیں، جیسے سمندر میں موجیں۔ اس سارے جسم میں طبعی تقاضا کرنے والی ایک خاص قوت ہے، جو تمام اجزا کو ان کی اپنی اپنی مناسب شکلوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اس جسم کو مع اس کی تمام قوتوں کے ''شخصِ اکبر'' کہنا چاہیے۔

طبیعت الکل (کائنات کی طبیعی مرکزی قوت)

جسم کا ایک حصہ وہ ہے، جو ایک وقت میں عناصر کی شکل رکھتا تھا۔ پھر اس نے جڑی بوٹی وغیرہ نباتات کی شکل اختیار کر لی۔ غرض اس جسم کے مختلف اجزا، جو مختلف شکلیں بدلتے رہتے ہیں، ان سب کی مرکزی قوت اس بڑے جسم کے اندر محفوظ ہے۔ یہ مرکزی قوت شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں ''طبیعت الکل'' کہلاتی ہے۔

نفس الکل (روحِ اعظم)

جیسے ہر ایک انسان میں روح ہے، جو اُس کے علم اور ارادے کی مالک ہے۔ اسی طرح اس بڑے جسم، ''شخص اکبر'' کی ایک روح ہے، جو نفس الکل (روح اعظم) سے موسوم ہے۔

یا ذاتِ باری

شاہ صاحب کے فلسفے میں ''ذاتِ بحت'' کی اہمیت

شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں ''ذاتِ بحت'' یا ''ذاتِ باری'' اتنی کامل اور محیط ہے کہ اسے مزید کمال کے حصول کی کوئی احتیاج نہیں۔ اور یہ ایک ایسی ''حقیقتِ قُصویٰ'' ہے، جس کا دوسرے تمام حقائق مقابلہ نہیں کر سکتے۔ (19)

اس لحاظ سے ''روح مطلق'' ''شخص اکبر'' کی روح کا نام ہوگا۔ البتہ ذاتِ باری کے اندر جتنے کمالات ہیں، ان کو ایک بسیط وحدت تصور نہ کیا جائے۔ بلکہ تمام مختلف چیزیں اپنی اختلافی شان کو پورے طور پر محفوظ رکھتے ہوئے ''کمالاتِ ذاتیہ'' میں داخل ہیں۔ ان میں سے ہر چیز کو فلسفے میں ''اسمِ الٰہی'' کہا جاتا ہے۔ جن کے مجموعے کو ''اسماء کَونِیّہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''روح اعظم'' یا ''نفس کلیہ'' ان اسمائے کونیہ کا ایک مرکزی اسم بھی ہے۔

شاہ صاحبؒ کی نظر میں معاشرتی و اقتصادی ترقی اور طاقت، عقلی فلسفے کی پیداوار ہوتی ہے۔ اور اسلام جیسے بین الاقوامی دین کا فلسفہ، جملہ دنیا کی عقلیت پر غالب ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے اسلام اور انسانیت لازم و ملزوم ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس وقت تک انسانی نوع یہاں باقی رہے گی، انسانیت کے لیے خود اسلام کا رہنا بھی ضروری ہے۔ اور انسانیت کی ترقی سے ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی صفتِ ذاتیہ کے کمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کا دیگر فلسفوں سے موازنہ

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کا موازنہ عصرِ حاضر میں موجود سرمایہ داری نظام اور سوشل اِزم کے فلسفوں سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں

نظاموں کے فلسفے حقائق کائنات کے تناظر میں ناقص اور ادھورے ہیں۔ ان فلسفوں میں محدود دائرے میں رہ کر محض ظاہری مادی امور کا تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن نوعِ انسانیت اور حقائق کائنات کے تناظر میں یہ فلسفے جامعیت کے حامل نہیں ہیں۔ سطحیت اور محض تصوراتی خیالات کے حامل ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مادی قوانین کا انسانی زندگی پر اطلاق کیا گیا ہے۔ ذیل میں مختصراً ان فلسفوں کی حقیقت و ماہیت واضح کی جاتی ہے۔ اور ان کا اختصار کے ساتھ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے سے موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

یورپین فلسفوں کی اساسیات اور ان کا پس منظر

یورپ کی نشأتِ ثانیہ سے قبل سوسائٹی کے عملی نظام میں مسخ شدہ عیسائیت اور فلسفہ یونان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اور یہ دونوں یورپ کے فرسودہ جاگیرداری نظام کے ساتھ مل کر انسانیت کے سیاسی، معاشی اور سماجی استحصال میں برابر کے شریک تھے۔ رجعت پسندی پر مشتمل پاپائیت اور مسخ شدہ فلسفہ یونان دونوں ہی معاشروں کی تشکیل نو میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر تھے۔ یوں انسانیت مسلسل ظلم و جبر کا شکار تھی۔ گویا مذہب اور فلسفہ انسانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے کردار ادا نہیں کر رہا تھا۔

ایسے حالات میں یورپ میں اس ظلم و جبر کے خلاف غور وفکر کرنے والے ذہنوں میں ان دونوں کے خلاف ردّ عمل پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایک طرف محض روح کو تسکین دینے کے نام پر قائم مسخ شدہ مذہب کا انکار کر دیا۔ اور یوں نہ صرف کائنات میں کارفرما روح کی طاقت وقوت کو ردّ کیا۔ اور مادی بنیادوں پر غور وفکر کو آگے بڑھایا، بلکہ خدا کے وجود کا بھی انکار کر دیا۔ گویا رجعت پسند مذہب کے ردّ عمل میں کائنات کے اہم ترین روحانی پہلوؤں کا قطعی انکار کر کے خالصتاً مادی بنیادوں پر غور وفکر شروع کر دیا گیا۔

اور جب مادی بنیادوں پر غور وفکر کا آغاز کیا گیا تو فلسفہ یونان بھی ان کے مسائل کے حل کرنے کے حوالے سے قاصر نظر آیا۔ کیوں کہ یورپ کے ہزار سالہ اندھیر نگری (Dark Age) کے زمانے میں فلسفہ یونان کا ارتقا بھی رُک چکا تھا۔ اس میں بھی ٹھہراؤ اور جمود تھا۔ محض نظریاتی بحثوں میں اُلجھنے کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کے محرکات میں اس فلسفے کا بھی عملی طور پر کوئی کردار نہیں تھا۔ اس تناظر میں نئے غور وفکر کرنے والے فلاسفروں

نے جمود وسکون کے حامل ''اجتماعِ ضدین'' کو محال سمجھنے والے فلسفہ یونان کے بہت سے امور کا بھی انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے مقابلے پر مادی بنیادوں پر ''اجتماعِ ضدین'' کی اساس پر ''فلسفہ جدلیت'' تشکیل دیا گیا۔

یوں تو یورپ میں مفکرین نے اس غور وفکر کے دوران بہت سے نظریات وافکار پیش کیے، لیکن سرمایہ داری نظام اور سوشل اِزم کے فلسفوں کی تشکیل میں جن بنیادی نظریات نے کردار ادا کیا، وہ درجِ ذیل ہیں:

[۱] فیورباخ (Feuer Bach) کا ''نظریۂ اصل مادہ''(20)

[۲] ڈارون (Darwin) کا ''نظریۂ ارتقا''(21)

[۳] روسو (Rousseau) کا ''نظریۂ اجتماع''(22)

[۴] ہیگل (Hegel) کا ''نظریۂ جدلیت''(23)

ان چاروں نظریات نے یورپ کے ان دونوں نظاموں کے فلسفوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

فاشستی (سرمایہ دارانہ) نظام کا فلسفہ

فاشستی (سرمایہ دارانہ) نظام میں سارا زور فرد کی انفرادیت، صلاحیت اور ذاتی ملکیت پر دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے بنیادی فلسفے میں مادی بنیادوں پر سرمائے (Capital) کی ذاتی ملکیت اور اس کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مذہب، روح اور خدا کے انکار کی اساس پر مادی بنیادوں پر حیوانی ارتقا کے نظریے کو سامنے رکھا گیا۔ اس طرح غور وفکر کا لازمی نتیجہ ایک ایسے نظریۂ اجتماعِ انسانیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جس کا نتیجہ سرمایہ داری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد جب مادی چیزوں میں کیپٹل اور سرمائے کی طاقت تمام چیزوں کو اپنے گرد گھما رہی ہے تو سب سے طاقت وَر چیز ''سرمایہ'' (Capital) قرار پایا۔ اس لیے اُسے ''اصل'' قرار دے دیا گیا۔ اور ڈارون کے نظریے کے مطابق انسان چوں کہ حیوان کی ارتقائی شکل ''سماجی جانور'' (Social Animal) ہے، اس لیے حیوانی زندگی کا قانون ''طاقت ہی سچائی ہے'' (Might is Right) انسانی اجتماع

پر بھی لاگو کر دیا گیا۔ چناں چہ یہ اصول تسلیم کرلیا گیا کہ جس انسان یا گروہ کے پاس سرمائے کی طاقت ہے، صرف وہی اپنی اس مادی طاقت کے بل بوتے پر سیاسی، معاشی اور عمرانی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔ گویا انسانی اجتماع کے تمام سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں کی تشکیل کا مرکزی نقطہ ''سرمایہ'' بن گیا۔ اس طرح سرمائے کو''اصل'' قرار دے کر تمام چیزوں کو اس کے گرد گھمانے کی اساس پر ہی سرمایہ داری نظام کا فلسفہ متعین ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

اس طرح سرمایہ دارانہ فلسفے میں ''نظریۂ اصل مادہ'' اور ''نظریۂ ارتقا'' کی اساس پر ایسا ''نظریۂ اجتماع'' وجود میں آتا ہے، جو سرمائے کی طاقت کو حیوانی اصول سے ملا کر سیاسی جبر اور اقتصادی ناانصافی کا سبب بنتا ہے۔ اس سے اجتماعی اور تمدنی زندگی میں معاشی فلاح اور خوش حالی کا ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

سوشل اِزم کے فلسفے کی اساس

سوشل اِزم کے بانی ''کارل مارکس'' (Karl Marx) نے مذکورہ بالا چاروں نظریات کو سامنے رکھ کر اپنا فلسفہ تشکیل دیا۔ اس فلسفے میں بھی نظریۂ اصل مادہ اور نظریۂ ارتقا کو انسانی اجتماع کی اساس بنایا گیا ہے۔ اس طرح ایک ایسا نظریۂ اجتماع وجود میں آیا، جس میں نظریۂ جدلیت کی مادی تشریح کرتے ہوئے سرمائے کی مادی طاقت کو انفرادی ملکیت کے بجائے ریاستی ملکیت اور اس کی طاقت قرار دے دیا گیا۔ چوں کہ ''مارکس'' کے فلسفے میں ہیگل کے ''نظریۂ جدلیت'' اور فیورباخ کے ''نظریۂ مادیت'' کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، اس لیے اس فلسفے کو''مادی فلسفہ جدلیت'' کہا جانے لگا۔

ہیگل کا فلسفہ جدلیت اور روحِ عالم

ہیگل (Hegel) کے فلسفے کا مدار ''پیکارِ اَضداد'' (dialectics) پر ہے۔ دنیا میں اب تک جتنی ترقی ہوئی ہے، ہیگل نے اس کا حقیقی سبب اضداد کے پیکار اور باہمی مناقشت (اور جدل) کو قرار دیا ہے۔ مثلاً مختلف خیالات (Thesis) اور تصورات (Anti Thesis) کی باہمی آویزش اور تصادمِ اَضداد (اَضداد کے ٹکراؤ) سے ایک

تیسرا تصور یا خیال (Syn Thesis) وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ہیگل نے اس باہمی نزاع اور جدلی عمل کا حقیقی محرک یا منبع ایک مخفی قوت کو قرار دیا ہے۔ جس کو اس نے ''رُوحِ عالم یا روح مطلق'' کا نام دیا ہے۔ ہیگل کے فلسفے میں ''روح مطلق'' اپنی تکمیل کے لیے اس نزاعی اور جدلی نظام کا تقاضا کرتی رہتی ہے۔ کیوں کہ اس جدلی عمل اور کھینچ تان سے جو نیا تصور وجود میں آتا ہے، وہ پہلے تصور سے زیادہ جامعیت اور وسعت رکھتا ہے۔ ترقی کا یہ سلسلہ اس وقت تک آگے بڑھتا رہے گا، جب تک کہ روح مطلق ترقی اور کمال کی اعلیٰ منزل پر پہنچ جائے۔ اس دنیا یا عالم اجسام میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے، وہ ''روحِ مطلق'' کے تقاضے کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے مقتضا کا ایک عکس ہے۔ انسان اپنے آپ کو بظاہر تو آزاد اور مختار سمجھتا ہے، لیکن اصل میں یہ روح مطلق کا ایک مظہر ہے۔ جس کسی میں ''روح مطلق'' کے تقاضے کا ظہور کامل طور پر ہوگا، اسے روح سے بھی قوی رابطہ ہوگا۔ اور وہ کامل طور پر ''روحِ مطلق'' کی تجلی کہلائے گا۔

کارل مارکس کا مادی فلسفہ جدلیت

کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفہ جدلیت میں سے ''روحِ کل'' کے تصور کا انکار کرتے ہوئے اسے مادی بنیادوں پر ترتیب دیا۔ چناں چہ اس نے مادے کو اصل قرار دیتے ہوئے انسانوں کی اجتماعیت میں موجود تاریخی جدلیت کو اہمیت دی۔ اور یوں مادی فلسفہ جدلیت کی تشکیل کی۔ اس کے خیال میں انسانی معاشروں میں پہلے کیپٹل کی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے ردِّ عمل میں مزدوروں کی اجتماعی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور ان کے باہمی جدل سے اشتراکیت پر مبنی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس طرح مارکس کے بقول سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی آویزش اور تاریخی جدل کے نتیجے میں مادی بنیادوں پر ایک بہتر نظام کی تشکیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ سرمائے کی وہ طاقت، جو پہلے سرمایہ داری کے پاس تھی، وہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی باہمی کش مکش کے نتیجے میں اشتراکیت پر مبنی ریاستی طاقت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اسی لیے اس کے نزدیک سوشل اِزم سے پہلے کسی معاشرے میں سرمایہ داری کا موجود ہونا ضروری ہے۔ زرعی معاشروں میں چوں کہ مزدور سرمایہ دار کش مکش نہیں ہوتی، اس لیے ان معاشروں میں سوشل اِزم کا قائم ہونا ممکن نہیں۔

ان دونوں فلسفوں کا تنقیدی جائزہ

ان دونوں فلسفوں کا تحقیقی بنیادوں پر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو درجِ ذیل امور واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

1۔ چوں کہ یورپ میں موجود مذاہب عیسائیت و یہودیت اور فلسفہ یونان ان کی سماجی تشکیل کے امور میں رہنمائی دینے سے قاصر تھے، اس لیے یہ دونوں فلسفے ایسے رجعت پسند مذاہب اور فرسودہ فلسفہ یونان کے ردِّعمل میں سامنے آئے۔

2۔ ان دونوں فلسفوں میں کائنات میں موجود روح کی حقیقت کا انکار کیا گیا ہے۔ محض مادی بنیادوں پر کائنات کا ناقص اور ادھورا مطالعہ فلسفوں کے نقص اور ادھورے پن پر دلالت کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ کائنات محض مادی نہیں ہے، بلکہ مادے کے ساتھ ساتھ روح کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس بات پر دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ ابتدائے انسانیت سے لے کر اب تک نوعِ انسانیت کی اکثریت کا اتفاق بھی اہم ترین دلیل ہے۔

3۔ محض مادی بنیادوں پر بھی ان دونوں فلسفوں کا مطالعہ ناقص اور ادھورا ہے۔ اس لیے کہ بے جان مادی اجسام کے قوانین کو نوعِ انسانیت کے لیے روبہ عمل لانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ نوعِ انسانیت اپنے طبعی اور مادی تقاضوں کے حوالے سے معدنیات، نباتات اور حیوانات پر مشتمل مادی کیمسٹری سے کہیں زیادہ جامع، متنوع اور کلی حیثیت رکھتی ہے۔ کم تر مادی کیمسٹری رکھنے والے قوانین کو، مادی حوالے سے زیادہ ترقی یافتہ اور روحانی تقاضوں کی حامل انسانیت پر فٹ کرنا خود مادی اور طبعی پراسس کی بھی خلاف ورزی ہے۔

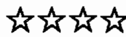
4۔ ان دونوں فلسفوں میں نوعِ انسانیت کے بنیادی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ معاشروں کی سیاسی، معاشی اور سماجی تشکیل نوعِ انسانیت کے لیے کی جاتی ہے۔ اس لیے ''انسانیت'' کو چھوڑ کر ''سرمائے'' کو اصل قرار دینا یا محض مادی حوالے سے تاریخی جدلیت کو پیشِ نظر رکھنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ انسانیت اصل ہے۔ اور نوعِ انسانیت کے مادی و طبعی اور روحانی و اَخلاقی تقاضوں کی

تکمیل پر مبنی سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کی تشکیل اس کی بنیادی ضرورت ہے۔
اور ان دونوں نظاموں کے فلسفے اس حوالے سے جامع طور پر کوئی رہنمائی پیش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے کلی تقاضوں کی تکمیل کے راستوں میں رُکاوٹ ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی جامعیت

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے میں وہ نقائص اور کمزوریاں نہیں ہیں، جو ان دونوں نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں نوعِ انسانیت کی وحدت (شخص اصغر) اور کائنات کی وحدت (شخص اکبر) کو بنیادی حیثیت ہے۔ اور ان وحدتوں پر ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ اپنے فلسفے کی روشنی میں وحدتِ نوعِ انسانی کی اساس پر نظریۂ اجتماع پیش کرتے ہیں۔ گویا کہ خود انسانیت ہی شاہ صاحبؒ کے نظریۂ اجتماع کی اساس ہے۔

چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ملکیت اور بہیمیت پر مشتمل وحدتِ نوعِ انسانیت کے مادی اور طبعی تقاضوں کی تکمیل کے لیے "چار ارتفاقات" پر مبنی عملی نظام پیش کیا۔ اور اس کے روحانی اور اَخلاقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے "چار بنیادی اَخلاق" کی نشان دہی کی۔ پھر یہی نہیں، بلکہ نوعِ انسانیت کے حیوانی اور طبعی ارتقا پر بھی بڑی جامع گفتگو فرمائی۔ اور اس کے ملکی تقاضوں کے ارتقا اور عملی کردار کی بھی جامعیت کے ساتھ نشان دہی کی۔ شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی مزید تفصیل کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔



حوالہ جات وحواشی

1۔ شیخ الاسلام خواجہ قطب الدین اوشی دہلویؒ کی طرف سے روحانی طور پر شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ کو آپؒ کی بشارت سنائی گئی تھی۔ اس لیے آپ کا ایک نام قطب الدین احمد بھی رکھا گیا۔

2۔ علم الکلام۔ تالیف: علامہ شبلی نعمانیؒ۔ ص:........

3۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ "التمہید" میں لکھتے ہیں:

"کان الشّیخ الأجلّ الشّیخ عبد الرّحیم بن وجیه الدین أخذ العلوم والمعارف عن

المجتمع الإسلامی العالم گیری، وتوارث المعارف الخاصّة عن جدّه لأمّه الشّیخ رفیع الدّین" (التّمهید لتعریف أئمّة التّجدید. ص:66. مطبوعه: لجنة أحیاء أدب السندی بجام شورو، باکستان)

4۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ص:14-15۔مطبوعہ: کتاب خانہ پنجاب، لاہور۔ 1942ء۔

5. مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے "التّمهید" میں لکھا ہے:

"قد تحقّق عندی أنّ الشّیخ الأجل عبدالرّحیم بن وجیه الدّین الدّهلوی هو الّذی بذر بذور التّحقیق و التّجدید الّذی یدعو إلیه الإمام شاه ولی اللّٰه الدّهلویؒ.." إلیٰ آخره (التّمهید لتعریف ائمّة التّجدید۔ص: 67۔مطبوعہ:لجنۃ أحیاء أدب السندی بجام شورو، باکستان)

6۔ ولی اللّٰہی دعوت کے چار اصول مولانا قاسمی صاحبؒ نے امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی کتاب "التّمهید" سے نقل کیے ہیں۔ یہاں پر اصل کتاب میں مولانا قاسمیؒ نے چار اصولوں کا تذکرہ کر کے صرف ایک اصول "قرآن میں تدبر" کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ بقیہ تین اصولوں کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا۔ ہم نے "تمہید" میں بیان کردہ باقی تین اصولوں کا بھی یہاں اضافہ کر دیا ہے۔ تا کہ چار کی گنتی پوری ہو جائے۔ اور پڑھنے والے کو تشنگی کا جو احساس ہوتا ہے، وہ ختم ہو جائے۔

7۔ انفاسِ رحیمیہ (مکتوبات امام عبدالرحیم دہلویؒ) ص 27، طبع مجتبائی، دہلی 1333ھ/ 1915ء۔

8۔ بوارق المعرفہ، مشمولہ انفاس العارفین، ص82، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

9۔ الجزء اللطیف، مشمولہ انفاس العارفین، ص196، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

10۔ امام عبیداللہ سندھیؒ "التمهید" میں فرماتے ہیں:

"وقد جعل الإمام ولی اللّٰه قراء ة القرآن مع التدبّر سنّة لازمة ثمّ تبعه علیٰ ذالک أولاده" ... الخ. (التمهید لتعریف ائمّة التجدید. فصل:2. باب:10. ص:68. مطبوعه: حیدر آباد، سندھ)

11۔ یہاں اصل کتاب میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ لکھی گئی تھی: "هلک قیصر فلا قیصر و هلک کسرىٰ فلا کسرىٰ." لیکن بخاری اور مسلم کے الفاظ وہ ہیں، جو متن میں درج کر دیے گئے ہیں۔ امام بخاریؒ نے یہ حدیث "کتاب الجهاد و السیر" کے "باب الحرب خدعة" میں روایت کی ہے۔ (دیکھیے! صحیح بخاری۔ حدیث نمبر: 3027۔ طبع: بیروت) اور امام مسلمؒ نے یہ حدیث صحیح مسلم میں "کتاب الفتن و اشراط الساعة" کے "باب لاتکون الساعة حتّی یمرّ الرّجل بقبر الرّجل، فیتمنّی أن یکون مکان المیّت من البلاء" میں ہے۔ (دیکھیے! صحیح

مسلم۔ حدیث نمبر 7329۔ طبع: بیروت)

12۔ حجۃ اللہ البالغہ، باب إقامۃ الارتفاقات و إصلاح الرسوم، جلد: اول۔ صفحہ: 21-220۔ طبع بیروت۔

13۔ ایضاً۔ ص: 23-222۔

14۔ شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک۔ مولانا استاذ عبیداللہ سندھیؒ، صفحہ 28، مطبوعہ سندھ ساگرا کادمی، لاہور۔

15۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ من ابواب ابتغاء الرزق۔ جلد: 02۔ صفحہ 665۔ طبع: بیروت۔

16۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فلسفے کی اہمیت اور اس کی حقیقت و ماہیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب انسانیت کا ایک حصہ کسی بڑے قطعہ زمین میں لمبی مدت تک مل جل کر رہتا ہے اور قدرتِ الٰہیہ اس کی طبعی ترقی کے لیے عقلی اور اَخلاقی بلندی کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ یعنی اس میں انبیائے کرامؑ اور اولیائے عظام کے ساتھ اصلح سلاطین اور حکام بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یا حکما اور شعرا کے ساتھ عدالت شعار بادشاہ اور بلند ہمت سپاہی برسرِ کار آتے ہیں۔ اس طرح وہ بڑی قوم ترقی کے تمام مدارج طے کرتی ہے۔ اپنی حکومت کا نظام بناتی ہے۔ جس سے ظلم کی بیخ کنی ہو۔ شہر بساتی ہے۔ علم و ہنر پھیلاتی ہے۔ جس سے رفاہیتِ عامہ کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ اس کی ہمسایہ قومیں اس کی رفاقت اور سرپرستی میں اپنی فلاح سمجھتی ہیں۔ اگر اس (قوم) کی اجتماعی تاریخ کو انسانیت کے عام پسند عقلی افکار و اَخلاق پر مرتب کیا جائے تو اسے ''حکمتُ الادیان'' یا ''فلسفہ تاریخ'' کہا جاتا ہے۔''

(خطبات و مقالات۔ ص: 95-394۔ مطبوعہ: دارالتحقیق والاشاعت۔ لاہور)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے کی حقیقت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ:

(الف) ایک قوم ایک لمبی مدت تک اپنا عدل و انصاف کا نظام قائم کیے ہوئے ہو۔

(ب) ایسے نظام کے قیام میں انبیاؑ کی تعلیمات یا حکما کے افکار و نظریات اور اَخلاق کارفرما ہوں۔

(ج) ان افکار و نظریات اور اَخلاق کو مربوط طور پر سمجھنے کا نام ''فلسفہ'' ہے۔

اس طرح کسی معاشرے میں موجود عملی نظام، فکر و نظریے اور فلسفے میں بنیادی فرق یہی ہے۔ چناں چہ ان تینوں یعنی نظام، فکر و نظریہ اور فلسفے کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ (آزاد)

17۔ تفسیر المقام المحمود۔ پارہ عمّ، سورۃ الاخلاص۔ از امالی مولانا الاستاذ علامہ عبیداللہ سندھیؒ۔ ص: 163۔ طبع: مکی دارالکتب، لاہور۔

18۔ شاہ صاحبؒ نے دین اسلام کی تعلیمات کے بنیادی فلسفے کی تشریح اپنی چند کتابوں میں بیان کی ہے۔

''سطعات'' میں کائنات اور موجودات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سرِّ سخن ایں است: ''وجود'' کہ بمعنی ''ہستی'' نہ بمعنی مصدری در سہ مرتبہ است:

(۱) ذاتِ بحت (۲) و مرتبہ عقل (۳) و شخص اکبر..... (سطعہ نمبر 1)

(راز کی بات یہ ہے کہ ''وجود''، ''ہستی'' کے معنی میں، نہ کہ ''مصدری'' اور ''حدوثی'' معنی میں۔ تین مرتبے رکھتا ہے:

(۱) ذاتِ بحت (ذاتِ باری تعالیٰ)

(۲) مرتبہ عقل (صفاتِ باری تعالیٰ)

(۳) شخصِ اکبر (تمام مخلوقات پر مشتمل یہ کائنات)

پھر "شخصِ اکبر" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شخصِ اکبر شئے واحد است بوحدتے از وحدات، لیکن چوں اورا برشگافیم دو جز ظاہر شود: (۱) نفس کل (۲) ونفس رحمانی۔ نفس کل حال ومحصل است ونفس رحمانی محل وموضوع۔" (سطعہ نمبر 2)

"شخصِ اکبر" وحدتوں میں سے ایک وحدت لیے ہوئے ہے۔ لیکن جب ہم اس کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو اس میں دو اجزا ظاہر ہوتے ہیں: (۱) نفس کل (۲) نفس رحمانی۔ نفس کل اس کائنات کے اندر فعالیت کی حالت رکھتا ہے۔ اور نفس رحمانی محل اور موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔"

شاہ صاحبؒ کی تشریح کی وضاحت کے لیے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ نے اس پر فارسی میں ایک مفصل حاشیہ لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

"حضرت الامام شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ عالم جسمانی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ ایک ایسا مستقل جسم رکھتا ہے، جس میں بہت سی مختلف قوتیں کارفرما ہیں۔ ان قوتوں میں قوتِ خیال، قوتِ ارادہ اور ایسی قوت جو طبعی خواہشات وغیرہ کا تقاضا کرتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کائنات کے اس ایک مستقل جسم کا نام "شخصِ اکبر" رکھا ہے۔

اس کی وہ قوت، جو طبعی چیزوں کا تقاضا کرتی ہے اور ان طبعی تقاضوں کے مطابق تمام اجزا میں باہمی تناسب کے اعتبار سے تغیر و تبدیلی کرتی رہتی ہے، اس کو شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں "طبیعت الکل" کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہر انسان کے لیے ایک روح ہے، اور وہ اس کے علم اور ارادے کا مرکز ہوتی ہے، ایسے ہی اس "شخصِ اکبر" کے لیے ایک روح ہے۔ اس کو "نفس الکل" کہا جاتا ہے۔ اس شخصِ اکبر میں موجود تمام روحوں کی اس روح سے نسبت ایسے ہی ہے، جیسے انسان کے جسم میں موجود تمام حواس اور محسوسات کی نسبت انسانی روح کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ بڑی روح (روحِ کبیر) یا "نفس الکل" تمام چھوٹی ارواح پر حکومت کرتی ہے۔

شخصِ اکبر کی "قوتِ خیال" کو "عالمِ مثال" کہا جاتا ہے۔ اور وہ جو غالب قوتِ ارادی رکھتا ہے، اس کو "شخصِ اکبر" کا "دل" کہا جاتا ہے۔ اور وہ "نفس الکل" کا "عرش" ہے۔ اس عرش پر شخصِ اکبر کے خالق یعنی "ذاتِ بحت" کا عکس پڑتا ہے۔ اس عکس سے شخصِ اکبر کے دماغ میں ایک صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا نام "تجلی اعظم" ہے۔ اور تجلی اعظم سے ایک عکس شخصِ اکبر کے قلب پر بھی پڑتا ہے۔ اس کو بھی "تجلی اعظم" کہتے ہیں۔ لیکن یہ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ "اعظم" کی صفت کے بغیر تجلی کا اطلاق زیادہ مشہور ہے۔

وہ تجلی، جو شخص اکبر کے دماغ پر پڑتی ہے، یعنی "تجلی اعظم"، اس کو "غیب" بھی کہتے ہیں۔ ذاتِ حق اپنے تمام کمالات کے ساتھ حقیقی اور مستقل بالذات ہے۔ اور شخص اکبر سے بالکل علاحدہ اور جدا ہے۔ اس کو "غیب الغیب" اور "ذاتِ بحت" کہتے ہیں۔"

مولانا قاسمیؒ کی اس تشریح سے کائنات کی وحدت، اس کے اجزا، اس میں موجود کارفرما قوتوں اور ان کے باہمی تعلق پر بڑی جامعیت سے وضاحت ہوجاتی ہے۔ ذرا غور و فکر سے شاہ صاحبؒ کے فلسفے کا بنیادی خاکہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ فافهم و تدبّر!

(دیکھیے! فارسی حاشیہ سطعات، ص: 03۔ مطبوعہ: شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ)

19۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ "البدور البازغۃ" میں فرماتے ہیں:

"الحقائق كلّها ترجع إلى الحقيقة واحدة تكون شرحًا لها وتفصيلاً لإجمالها"..... (ص: 03) .... إنّما الوحدة الحقّة (الحقيقة القصوىٰ) كلمة لاتزاحم الكلمات ..." الخ (ص: 04)

(تمام حقائق اسی ایک حقیقت کی جانب لوٹتے ہیں۔ گویا کہ وہ اُسی حقیقت کی شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ وحدتِ حقیقی اور حقیقتِ قصویٰ ایسا کلمہ ہے، کہ جس کی مزاحمت کوئی اور کلمہ نہیں کرتا)

(دیکھیے! البدور البازغہ، تالیف: شاہ ولی اللہ، ص: 4-3۔ مطبوعہ: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد)

20۔ **فیورباخ کا نظریۂ اصلِ مادہ:** جرمن مادیت پسند فلسفی لڈوگ فیورباخ (Feuer Bach, Ludwig) (1804ء-1872ء) نے 1830ء میں مذہب کا انکار کیا۔ بلکہ اس نے خدا کے وجود کا انکار کرکے مادیت پرستی کی تعلیم دی۔ اس طرح اس دور کے نوجوانوں کی بڑی تعداد مذہبی دائرے سے نکل کر مادیت اور دہریت کی طرف آگئی۔ فیورباخ کے مادی نظریات نے اس کے معاصر فلسفیوں پر بھی بڑا اثر کیا۔ حتیٰ کہ مارکس کے ساتھی انجلز نے فیورباخ کے بارے میں لکھا ہے کہ: "جذبات کی شدت کی بدولت بالآخر ہم سب فی الفور فیورباخ بن گئے۔" (مارکس انجلز منتخب تحریریں، جلد2۔ ص: 368) فیورباخ کے مادیت پسند افکار کا ایک اہم جز "علم بشریات" (Anthropologism) ہے۔ (لغات سماجی علوم و فلسفہ۔ ص: 19-118)

مادیت پرستی کے حوالے سے اس سے پہلے ایک فرانسیسی مادیت پرست فلسفی ہولباخ (Holbach) نے بھی 1770ء میں مذہب اور تصوریت پسند فلسفے پر شدید ترین تنقید کی ہے۔ ہولباخ کہتا ہے کہ:

"مادہ ہی سب کچھ ہے۔ جو انسانی افکار و خیالات پر اثرانداز ہوتا ہے۔"

مادے کی خصوصیات کو وہ درجِ ذیل حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

1۔ وزن 2۔ ہیئت 3۔ ناقابلِ تقسیم ایٹم

مادے کی ایک اور خصوصیت "حرکت" (Motion) بھی ہے۔ جو خلا میں بہت ہی سادہ میکانکی

اجسام سے عبارت ہے۔ آدمی کائنات کا ایک جز ہے۔ اور قانونِ فطرت کے تابع ہے۔ ہولباخ فلسفہ جدلیت کی وکالت کرتا ہے۔ سیاسی طور پر ہولباخ قانونی ملوکیت کی حمایت کرتا ہے۔ (لغات سماجی علوم و فلسفہ۔ مصنف: روزین تھال۔ ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہی۔ ص 154۔ طبع لاہور)

21۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا (Evolution Theory): یورپین معاشرے کو دوسرے جس نظریے نے بہت زیادہ متاثر کیا، وہ ڈارون (Darwin) (1809ء - 1882ء) کا ''نظریۂ ارتقا'' (Evolution Theory) ہے۔ یہ نظریہ ''علم الحیاتیات'' (Biology) اور ''علم العضویات'' (Organism) تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا اثر انسانی تاریخ (History)، انسانی نفسیات (Psychology) اور انسانی اجتماعیت (Sociology) تک پھیل گیا۔ جس سے بے شمار فکری اور عملی نتائج مرتب ہوئے۔

نظریۂ ارتقا کے مطابق درج ذیل تین بنیادی اسباب کے نتیجے میں ارتقا ہوتا ہے۔

(i) تنازع للبقا (Struggle for Existence)

(ii) بقائے اصلح (Survivel of Fittest)

(iii) انتخابِ طبعی (Natural Selection)

اس نظریۂ ارتقا کے مطابق تخلیق کائنات کا جو نظریہ تیار ہوا، اس کی رُو سے تخلیق کے تین درجے قائم ہوتے ہیں:

پہلا درجہ: عناصر (Elements) اور سالمات کا مادے سے ظہور ہوا۔ اور افلاک، نظامِ شمسی، زمین، سمندر اور دریاؤں وغیرہ کی تخلیق ہوئی۔

دوسرا درجہ: نباتاتی و حیواناتی خلیوں (Sells) کی تخلیق ہوئی۔ اور ان کے نشو و ارتقا سے مختلف نباتات و حیوانات کا درجہ بدرجہ ظہور ہوا۔ یہ انسان کے وجود کی تکمیل اور ارتقائی تشکیل کا ایک مرحلہ ہے۔

تیسرا درجہ: انسان کی نفسیاتی و دماغی کیفیتوں کے نشو و نما اور ظہور و ارتقا کا مرحلہ ہے۔

ڈارون کے نزدیک جانداروں کے درمیان کشمکش حیات کا عمل اس لیے جاری رہتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی پیداوار سلسلۂ توالد و تناسل کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔ ڈارون نے اپنے اس نظریے کو پیش کرنے کے لیے ایک کتاب ''اصلِ انواع'' (Origin of Spescies) لکھی۔ جس میں اپنے اس نظریے کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کی۔

(لغات سماجی علوم، ص: 109، نظامِ معیشت اور اسلام۔ از ڈاکٹر احمد حسین کمال۔ ص: 11-10)

22۔ روسو کا نظریۂ اجتماع یا معاہدۂ عمرانی: اٹھارویں صدی کے وسط میں ''روسو ژان ژاکس'' (Rousseau Jean Jaeques) نے یورپ میں موجود صدیوں سے افکار و خیالات کے خلاف باغیانہ افکار کی اشاعت کی۔ چناں چہ اس نے 1750ء میں اپنے ایک مقالے میں قدیم علوم و فنون کی بالادستی کے تصور کی دھجیاں بکھیر ڈالیں۔ اور محض علم کی بدولت حاصل کردہ ترقی کے تصور کا

طلسم پاش پاش کر دیا۔ اس نے دوسرا مقالہ 1753ء میں ''انسانوں میں عدمِ مساوات کا آغاز'' کے عنوان سے لکھا۔ جس میں اس نے زوردار الفاظ میں کہا کہ: ''انسانوں میں عدمِ مساوات پیدا کرنے کا واحد ذریعہ دولت ہے۔''

اس نے 1763ء میں ''سوشل کنٹریکٹ'' کے نام سے تیسری کتاب لکھی۔ جس کا آغاز اس جملے سے کیا: ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔''

اس کتاب میں روسو نے رائے عامہ اور رائے عامہ پر مبنی ''معاہدۂ عمرانی'' کا نظریہ پیش کیا۔ روسو کی ''تقریرِ پیرس'' کے مندرجہ ذیل جملے معاشی تصورات میں انقلاب کا موجب بنے:

''ابتدا میں سب انسان آزاد اور برابر تھے۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہ تھی۔ مال اور اسباب بھی سب کے درمیان مشترک تھا۔ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیا کرتا تھا۔ خوش حالی اور امن کی اس حالت سے گزر کر انسان آج جس ابتری و مشکل میں گرفتار ہوا ہے، اس کی وجہ ''ذاتی ملکیت'' کا دستور ہے۔''

اس کتاب میں بیان کیے ہوئے معاہدۂ عمرانی کے نظریے نے ایک نئے ''نظریۂ اجتماع'' کا تصور پیدا کیا۔ اس نظریۂ اجتماع کی اساس پر روسو کے پیش کردہ نظریات نے پُرزور انداز میں یورپ سے امریکہ تک ایک آگ سی لگا دی۔ ''ٹامس پین'' کے ذریعے روسو کے یہ افکار امریکہ پہنچے۔ اور 1782ء میں امریکہ کا انقلابِ آزادی رونما ہو گیا۔ اس سے تین سال قبل 1779ء میں فرانس کا مشہور انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے! عالمی انسائیکلوپیڈیا۔ ص: 87-1086۔ طبع: الفیصل ناشران، لاہور)

4۔ **ہیگل کا نظریۂ جدلیت:** ہیگل (Hegel) (1770ء - 1831ء) نے اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی انقلاب کو خوش آمدید کہتے ہوئے اس دور کے پروشیائی حکمرانوں، نوابوں، رئیسوں اور لارڈز وغیرہ کے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لیا۔ ہیگل کے فلسفے نے 1818ء میں فکری راہ پیدا کی۔ اس نے قدیم یونانی فلسفیوں کے نظریات، خاص طور پر سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) نظریات کا رد کیا۔ ان نظریات کی تین بنیادی خصوصیات تھیں:

1۔ یہ نظریات فطرت، معاشرے اور انسانی شعور کو ساکن سمجھتے تھے۔ اور اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان چیزوں میں ہر لحہ تغیر پیدا ہو رہا ہے۔

2۔ یہ نظریات فطرت، معاشرے اور انسانی ذہن میں مختلف عناصر کے باہمی تعلق سے انکار کرتے تھے۔ اور چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھتے تھے۔

3۔ یہ نظریات چیزوں کے درمیان تضاد سے انکار کرتے تھے۔ خاص طور پر قدیم یونانی فلاسفہ کسی ایک چیز میں اجتماعِ ضدین کا انکار کرتے تھے۔ اور ترقی کی وجہ بیرونی قوتوں کو بتاتے تھے۔

ہیگل نے ان نظریات کے مقابلے پر مندرجہ ذیل جدلیاتی (Dialectical) نظریات پیش کیے:

1۔ چیزوں اور واقعات کا الگ الگ مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ایک نظام کے بہت سے عناصر باہم متعلق ہیں۔ اور واقعات یا چیزوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہیگل کے الفاظ میں ''ہمیں کل کا مطالعہ کرنا چاہیے، نہ کہ علاحدہ علاحدہ عناصر کا۔''

2۔ اشیا اور مظاہر میں باہمی تعلق اور اثر ہوتا ہے، نہ کہ یک طرفہ تعلق یا اثر۔ مثلاً انسان کی سوچ اس کے عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا عمل اس کی سوچ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یوں عناصر کے باہمی تعلق کی اہمیت واضح ہے۔

3۔ تمام معاشرتی اور فطری اعمال تغیر پذیر ہیں۔ یہ تبدیلی کسی بیرونی قوت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہر شے کے اندرونی تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ تضاد تبدیلی کا محرک ہے۔ (100:58)۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ چیزوں کا اندرونی تضاد ان کے وجود کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً مادے کا بنیادی عنصر ''جوہر'' ہے۔ جوہر میں دو متضاد عناصر موجود ہیں: پروٹون (Proton) (بجلی کا مثبت چارج) اور الیکٹرون (Electron) (بجلی کا منفی چارج)۔ ان میں سے ایک بھی عنصر نکل جائے تو جوہر کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔

4۔ ہر شے یا خیال کا اِرتقا جدلیاتی عمل سے ہو رہا ہے۔ پہلے ہم ایک شے کا انکشاف کرتے ہیں۔ جسے مثبت (Thesis) کہا جائے گا۔ پھر ہم اس کی ضد (Anti-Thesis) معلوم کرتے ہیں۔ پھر ان دونوں کا اتحاد عمل میں آتا ہے۔ جسے ترکیب (Synthesis) کہا جاتا ہے۔ اور جو خود مثبت بن جاتا ہے۔ آگے چل کر اس دوسرے مثبت کی بھی نفی کی جاتی ہے۔ اور ایک نئی ترکیب پیدا ہوتی ہے۔ (18:70)۔ اس جدلیاتی اصول کو ہیگل نے ''نفی کی نفی'' (Negation of the negation) کا نام دیا ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ: ''پُرانے خیالات سے نئے خیالات اُبھرتے ہیں۔ جو پُرانے خیالات کی نفی کرتے ہیں۔'' اس لحاظ سے کوئی بھی خیال اٹل نہیں۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نفی ہو جاتی ہے۔

5۔ جب کسی عمل میں مقداری تبدیلی لائی جاتی ہے تو ایک وقت آتا ہے، جب اس میں کیفیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً جانوروں کے دماغ کی مقدار ارتقائی عمل کی وجہ سے بڑھتی گئی۔ اور جب ایک خاص مقدار تک پہنچی تو دماغ کی کیفیت میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ اور وہ انسانی دماغ میں تبدیل ہو گیا۔

ہیگل کے جدلیاتی نظریات نے یورپ کے ہر شعبے اور مکتبہ فکر کو بے حد متاثر کیا۔ ہیگل نے ''عین مطلق'' (Absolute Idea) کا نظریہ پیش کیا۔ ''عین مطلق'' سے مراد غیر مادی روح ہے۔ جو مطلق سچائی کا گہوارہ ہے۔ اسے تصوف میں ذاتِ کل یعنی ذاتِ باری تعالیٰ بھی کہا گیا ہے۔ ہیگل کے مطابق تمام فطری اور معاشرتی مظاہر ''عین مطلق'' پر مبنی اور اسی کا اظہار ہیں۔

(دیکھیے! نفسیات کا ارتقا۔ از رفیق جعفر۔ ص: 77-73۔ طبع: لاہور)

فصل دوم

اسلام کا قانونِ ملکیت اور قانونِ انفاق

اسلام کے نقطہ نظر سے ذاتی ملکیت

سرمایہ دارانہ نظام کی نصرت و حمایت، نہ صرف ''مالی سرمایہ داروں'' کی طرف سے بھی ہوتی رہتی ہے، بلکہ سرمایہ داروں کی ایک اور قسم ''علمی سرمایہ داروں'' کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔ ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ مالی سرمایہ داروں کی حیا سوز حرکات اور ارتکازِ دولت کے جواز میں شریعت کی آڑ لیتے ہیں۔ حال آں کہ شریعتِ مطہرہ کی رُوح، نظامِ سرمایہ داری کے ہی خلاف ہے۔

قرآنِ مقدس کی رُو سے تو فرد ہو یا اجتماع، وہ دُنیا کی کسی بھی چیز کا ذاتی مالک نہیں ہے۔ ہر چیز کا اصل مالک، صرف باری تعالیٰ ہے۔ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ انسان اس کی طرف سے نیابت کے فرائض انجام دے رہا ہے اور اس میں ہر چیز معاشرہ کی ملکیت میں داخل ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نقطہ نظر

ملکیت کا مفہوم

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اَراضی وغیرہ کی ذاتی ملکیت کے حوالے سے ایک واضح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق ملکیت کا مفہوم اشیا سے نفع اٹھانے کے بنیادی حق تک محدود ہے۔ اور اپنی اصل میں تمام اشیا اجتماعیت کے لیے وقف ہیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''والأرض كلّها فى الحقيقة بمنزلة مسجدٍ، أو رباطٍ، جعل وقفًا علىٰ أبناء السّبيل، وهم شركاء فيه، فيقدم الأسبق فالأسبق، و معنى الملك فى حقّ الآدمىّ كونه أحقّ بالإنتفاع من غيره.'' (1)

''حقیقت میں تمام زمین کی حیثیت مسجد یا سرائے کی طرح ہے۔ جسے مسافروں کے لیے وقف کیا جاتا ہے۔ اور وہ تمام لوگ اس میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ پس جو سب سے پہلے آجائے، وہ اُسے استعمال کرے اور پھر اس کے بعد جو دوسرا آئے، وہ استعمال کرے۔ آدمی کے حق میں ملکیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نفع اٹھانے میں دوسرے سے زیادہ حق دار ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک مفادِ عامہ کے دائرے میں رہتے ہوئے ملکیت کا قانون رہے گا۔ اور ملکیت کا مفہوم بھی متعلقہ شئے یا زمین سے نفع اٹھانے کی حد تک ہے۔ اصل ملکیت اللہ ربّ العزت کی رہے گی۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر زمین بے آباد ہوجائے اور اُس علاقے کے تمام لوگ کسی آفت کی وجہ سے ہلاک ہوجائیں تو انسانوں کی ملکیت ختم ہوکر اللہ کی ملکیت خالصتاً باقی رہے گی۔ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے:

''فإذا كانت الأرض علىٰ هٰذه الصّفة إنقطع عنها ملك الآدميّين، و خلصت لملك الله، و حكم مالم يحى قطّ لما ذكرناه من معنى الملك.'' (2)

''جب زمین اس طرح بے آباد ہوجائے تو اس پر آدمیوں کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے۔ اور خالص اللہ کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے۔ اور ایسی زمین کا حکم اُس زمین کی طرح ہوجاتا ہے، جو ابھی تک غیر آباد ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے ملکیت کے معنی اور مفہوم کی وضاحت کی ہے۔''

سماجی انصاف کے حصول کے لیے اجتماعی حوالے سے ملکیت کا یہ مفہوم بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ولی اللّٰہی نظریۂ معیشت میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نقطۂ نظر

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تالیف ''آبِ حیات'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

''جملہ اموال (تمام اشیا) مباح الاصل (اپنی اصل کے اعتبار سے تمام

لوگوں کے لیے) ہیں۔ اور بوجہ قبض و استیلا یا غلبہ (ان اشیا سے نفع اٹھانے کے لیے قبضہ کرنے کی وجہ سے) مملوک کہلاتے ہیں۔ ہر چیز اپنی ذات میں اللہ کی مِلک ہے۔ بیع وشرا (خرید وفروخت)، اجارہ (کرائے پر دینا)، ہبہ (تحفہ دینا) اور میراث وغیرہ اسبابِ حصولِ قبض ہیں۔ اسبابِ مِلک بالذات نہیں۔" (3)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا نقطہ نظر

اسی طرح سلسلۂ ولی اللّٰہی کی مشہور علمی شخصیت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ سورۂ بقرہ کی اس آیت "هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" (29:2) کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"جملہ اشیائے عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان "هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا" (4) (وہی ہے، جس نے جو سب کچھ زمین میں ہے، تمہارے واسطے پیدا کیا) تمام بنی آدم کی ملک معلوم ہوتی ہے۔ یعنی غرضِ خداوندی (خدا تعالیٰ کا مقصد) تمام اشیا کی پیدائش سے دفعِ حوائج جملۂ ناس (تمام انسانوں کی حاجات کو پورا کرنا) ہے۔ اور کوئی شئے فی حد ذاتہٖ (بذاتِ خود) کسی کی مملوکِ خاص (ذاتی ملکیت میں) نہیں۔ بلکہ ہر شئے اصل خلقت میں جملہ ناس (تمام انسانوں) میں مشترک ہے۔ اور من وجہ (ایک طرح) سب کی مملوک (ملکیت) ہے۔ ہاں! بوجہِ رفعِ نزاع (جھگڑا ختم کرنے) وحصولِ انتفاع (نفع اٹھانے کے لیے) قبضہ کو علتِ مِلک (ملکیت کا سبب) مقرر کیا گیا۔ اور جب تک کسی شئے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ (مستقل اور پورا قبضہ) باقی ہے، اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔

ہاں! خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے۔ بلکہ اس کو اَوروں (دوسروں) کے حوالے کر دے۔ کیوں کہ باعتبار اصل اَوروں (دوسروں) کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا۔ گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاؑ و صلحا اس سے بغایت مجتنب (انتہا درجہ اس سے پرہیز کرتے) رہے۔

چناں چہ احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بلکہ بعض صحابہ و تابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہر کیف غیر مناسب و خلافِ اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجہ (ضرورت سے زائد سرمائے) سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں۔ اور اَوروں (دوسروں) کی مِلک من وجہ (ایک لحاظ سے ملکیت) اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور من وجہ (ایک لحاظ سے) مالِ غیر (دوسرے کے مال) میں قابض و متصرف ہے۔ اور اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے۔ مگر بوجہ ضرورت و حصولِ انتفاع ''بقدرِ حاجت'' ہر کوئی مالِ مذکور سے منتفع (فائدہ اٹھا) سکتا ہے۔ ہاں! حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ (یعنی خائن شمار ہوگا)''۔ (5)

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی رائے

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ بخاری شریف کی شرح ''فیض الباری'' میں ''ابواب الحرث و المزارعۃ'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"و الحاصل أنّ حقّه علی الأرض كأنّهٗ ضعيف بالنّسبة إلی المنقولات و كأنّ اللّٰه تعالٰی خلقهٗ للزّراعة أو المنحة و من أراد غير ذالك فقد سلك مسلك الشّحّ و البخل." (6)

''خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا حق زمین پر اشیائے منتقلہ کی نسبت گویا کہ بہت کمزور ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو خود زراعت کے لیے یا دوسروں کو عطیہ دینے کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور جس نے اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کی تو وہ بخل اور کنجوسی کے راستے پر چلا۔''

مصر کے مشہور محقق مفتی محمد عبدہٗ کی رائے

مصر کے مشہور محقق عالم مفتی محمد عبدہٗ اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں:

یہ جملہ "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" جمیع فقہا کے اس معروف و مشہور قاعدہ پر دلیل ہے کہ "مخلوق اشیا میں اصل اباحت ہے۔" اور اس سے مراد، تمام اشیا سے کھانے پینے، اوڑھنے، دوا دارو، سواری اور زینت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ مخلوق کو اپنی دینداری دکھانے کے لیے کسی ایسی شے کو حرام کہنے کا حق نہیں ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مباح قرار دیا ہے۔ حلت و حرمت کا تمام تر مدار خدا کی طرف سے وحی اور اجازت پر ہے۔" (7)

حافظ ابن العربی مالکی نے محققین کے اس قاعدے پر کہ ہر شئے میں اصل اباحت (مباح ہونا) ہے، یہ اعتراض کیا ہے کہ "اگر اس قاعدے کو مان لیا جائے تو اس سے رشتہ داروں اور قریبی اعزہ کا باہمی نزاع پیدا ہوگا۔ صلہ رحمی منقطع ہوجائے گی۔ اور باہمی جنگ و جدال شروع ہوجائے گا۔" اس کے جواب میں اتنا کافی ہے کہ یہ نزاع اور جنگ و جدال تو تب ہو۔ جب قبض واستیلا اور غلبے کو ملک ظاہری کا سبب قرار نہ دیا جائے۔ یا اس کو سارے معاشرے کی ملکیت قرار نہ دیا جائے۔

قانونِ انفاق

مالی حقوق کا وسیع تر تصور ②

بعض علما مال و دولت کے حقوق کے سلسلے میں صرف زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر سرمایہ داری اور ارتکازِ دولت کے جواز کے قائل ہوگئے ہیں۔ حال آں کہ اس طرح معاشرے کو تنگ دستی، افلاس اور بدحالی سے نجات نہیں مل سکتی۔ محققین علما اور ائمہ اسلام کی یہ رائے ہے کہ زکوٰۃ کے سوا مال و دولت میں دوسرے حقوق واجبہ بھی ہیں۔

قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ کی تیسری آیت میں "متقین" کی صفات بیان کر کے یہ ارشاد ہوا ہے:

"وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" (3:2)

(ہم نے اُن کو جو رزق عطا کیا ہے، اس سے خرچ کرتے ہیں)

اس آیت میں اِنفاق یا خرچ کرنے کے متعلق آئمہ مفسرین کی مختلف آرا ہیں۔

حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ بن العربی نے ان اقوال کو ذکر کرنے کے بعد اس کو ترجیح دی ہے کہ:

''یہاں صرف زکوٰۃ مراد نہیں ہے، بلکہ ''اِنفاق'' سے مراد و مطلب عام ہے۔ چاہے زکوٰۃ ہو یا دوسرے حقوق ہوں۔ کیوں کہ آیت:

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (3:2)

(غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔)

میں ''غیب'' اور ''صلوٰۃ'' عموم پر محمول ہیں تو یہاں بھی انفاق سے عام معنی مراد ہوں گے۔'' (8)

ضرورت سے زائد مال نہ رکھا جائے

مشہور محدث ابنِ حزم ظاہری اَندلسی نے اس سلسلے میں اپنی مشہور عالم تالیف ''محلّٰی'' میں جو روایات نقل کی ہیں، وہ مولانا شیخ الہند محمود حسنؒ کی مذکورہ تحقیق کی کھل کر تائید کرتی ہیں، کہ ضرورت سے زائد مال محتاجوں میں تقسیم کیا جائے۔

''عن ابی سعید الخُدری رضی اللّٰہ عنہ: أنّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قال: من کان معہ فضلُ ظھرٍ فلیُعِد بہ علٰی من لاظھر لہ، ومن کان لہ فضلٌ مِنْ زادٍ فلیُعِد بہٖ علیٰ من لازاد لہٗ.

قال (ابوسعید خدریؓ): فذکر من أصناف المال ما ذکر حتّٰی رأینا انّہ لاحقّ لأحدٍ منّا فی فضلٍ.'' (9)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس اپنی حاجت سے زائد سواری ہو تو اسے چاہیے کہ وہ کسی ایسے شخص کو دے دے، جس کے پاس سواری نہ ہو۔ اور جس کے پاس کھانے پینے کا سامان حاجت سے زائد ہو تو اسے چاہیے کہ زائد از ضرورت سامان حاجت مند کو دے دے۔

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مال کی مختلف انواع کا ذکر فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھا کہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے زائد مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''قال عمر بن الخطّاب رضی اللّٰہ عنہ: لو استقبلتُ من

ماستدبرتُ لأخذتُ فضولَ أموال الأغنياء، فقسّمتُها علٰى فقراء المهاجرين." (10)

"حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس چیز کا مجھے اب اندازہ ہوا ہے، اگر اس کا پہلے سے علم ہوتا تو میں مالداروں کی زائد از ضرورت دولت اور مال لے کر فقرا مہاجرین میں بانٹ دیتا۔"

"وصَحَّ عن أبی عُبيدة بن الجرّاح، و ثلٰث مائة من الصّحابة رضی اللّٰه عنهم: ان زادهم فنی، فأمرهم ابو عبيدة فجمعوا وزادهم فی مُزَوّدَيْنِ وجعل يقوتهم إيّاها على السّواء." (11)

"حضرت ابو عبیدہؓ اور تین سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ روایت صحت کو پہنچی ہے کہ ان کے کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جتنا سامان موجود ہو، اس کو حاضر کرے۔ پھر سب نے اپنے اپنے سامان کو دو توشہ دانوں میں جمع کیا۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ اس سب کو سب میں برابر تقسیم کرتے تھے۔"

"عن محمّد بن علیّ: أنّه سمع علیًّؓ بن أبی طالب يقول: أنّ اللّٰه تعالٰی فرض على الأغنياء فی أقواتهم بقدر ما يكفی فقراء هم، فإن جاعوا، أو عروا، وجهدوا، فيمنع الأغنياء، فحقّ على اللّٰه تعالٰی أن يحاسبهم يوم القيامة و يعذّبهم عليه." (12)

"محمد بن علی سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ نے مال داروں کے اموال پر ان کے فقرا کی حاجت کو بقدرِ کفایت پورا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی تکلیف میں مبتلا ہوں اور مال دار اپنا حق ادا نہ کریں، تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کا حق ہے کہ ان سے قیامت کے دن حساب لے اور اس پر انہیں عذاب دے۔"

امام ابوبکر جصاص رازیؒ کی رائے

اس مسئلے میں ہم قارئین کی توجہ "فقہ حنفی" کے ایک عظیم محقق، حجۃ الاسلام ابوبکر احمد

بن علی الرازی الجصاص (وفات 370ھ) کی تالیف شہیر "احکام القرآن" کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ امام موصوف نے اس کتاب میں ایک عنوان قائم کیا ہے:

"بَابٌ هَلْ فِي الْمَالِ حَقٌّ وَاجِبٌ سِوَى الزَّكوٰةِ؟"

(یعنی کیا مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی حق واجب ہے؟)

اس باب کے تحت چند آیاتِ قرآنیہ واحادیث نبویہ کے ذکر کے بعد آیت:

"وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى" (177:2)

(مال کی محبت کے باوجود اُسے اپنے رشتے داروں پر خرچ کرنا)

کے تحت امام صاحب موصوفؒ رقم طراز ہیں:

"اس آیت میں صدقۂ واجب اور صدقۂ نفل دونوں کا احتمال ہے۔ اور نفسِ آیت میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ اس سے مراد صدقۂ واجب ہے۔ اس آیت میں تو صرف ترغیب اور اس پر ثواب کے وعدے کا ذکر ہے۔ کیوں کہ آیت میں "البِرّ" کا لفظ ہے۔ اور یہ لفظ فرض اور نفل دونوں کو شامل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آیت کے سیاق اور تلاوت کے نسق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ تو مراد نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ "وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ" میں زکوٰۃ کو اس پر عطف کیا گیا ہے۔ عطف کرنے سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے جس صدقے کا بیان ہے، اس سے مراد ومطلب، زکوٰۃ نہیں ہے۔

اسی لیے لوگوں میں سے بعض کا کہنا ہے کہ "اٰتَى الْمَالَ" سے مراد یہ ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا دوسرے حقوقِ واجبہ مراد ہیں۔ جیسے صلہ رحمی کرنا اس وقت واجب ہے، جب کہ کوئی رشتے دار شدید تکلیف میں مبتلا ہو، یا ایسے بھوکے انسان، جن کو بھوک نے ستایا ہو، ان کو اتنا دینا ضروری ہے کہ ان کی بھوک کا سد باب ہوجائے۔ اور اس کی اصل وہ حدیث ہے، جو حضرت شریک، ابوحمزہ سے، اور وہ عامر سے، اور عامر، فاطمہ بنت قیس سے، اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

"و في المال حقّ سوى الزّكوٰة۔"

"مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔"

اور پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کی:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ....اِلٰى آخر الآية."

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف کرو، لیکن نیکی یہ ہے کہ......آخر آیت تک۔" (13)

اس کے بعد امام ابو بکر جصاص رازی حنفیؒ نے زکوٰۃ کے حقوقِ واجبہ کی چند مثالیں دے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی اس حدیث کا بھی جواب دیا ہے، جس میں زکوٰۃ کو جملہ صدقات کا ناسخ بتایا جاتا ہے۔ (14)

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت: "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى" (مال کی محبت کے باوجود اُسے اپنے رشتے داروں پر خرچ کرنا) کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس سے ہمیں تعلیم ملتی ہے کہ اجتماعیت یا معاشرے کو اعتدال پر قائم رہنا چاہیے۔ اور یہ تب ہوسکتا ہے جب آیت مذکورہ پر عمل ہو۔ صالح اور متوسط معاشرے میں اجتماعیت مال و دولت کو ایک جگہ میں جمع ہونے نہیں دیتی۔ بلکہ اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ قوم کے افراد کو ان کی ضرورتوں اور حاجتوں سے غنی اور بے پرواہ بنا دے۔ تمدن کے بقا اور طویل مدت تک اس کے چلنے اور زندہ رہنے کا یہی طریقہ ہے۔ اس آیت میں جس معتدل اور متوسط معاشرے کا ذکر ہے، ایسا معاشرہ مال کے ساتھ محبت رکھتے ہوئے بھی اس کو اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیتا ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک فرد کو بھی محتاج نہیں چھوڑتا۔

ذوی القربیٰ پر مال کی صحیح تقسیم: ایک ضروری تنبیہ

قرابت داروں پر مال کی تقسیم کی دو صورتیں ہیں:

1۔ اوّل یہ کہ اس میں حکمت اور عقل مندی ملحوظ رہے۔ جس کی یہ صورت ہے کہ اپنے جملہ اقارب کو دیکھنا چاہیے۔ اور اُنھیں اُن کی استعداد اور لیاقت کے مطابق کسی کاروبار میں لگا دینا چاہیے۔ اگر ان میں سے کوئی سرمائے کی قلت کی وجہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا تو ضرورت کے موافق اس کی مالی امداد کی

جائے۔ تا کہ وہ اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائے۔ حکمت کے اصول پر قرابت داروں میں صحیح انفاق اور خرچ کرنے کی یہی صورت ہے۔

2۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو کسی کاروبار میں نہ لگائے۔ اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو جائے۔ یہ اس کے اور اس کے اقربا اور اعزہ کے حق میں خطرناک اور مہلک طریقہ ہے۔

یتیم اور مسکین پر خرچ کی نوعیت

قرابت داروں پر خرچ کرنے کے ذکر کے بعد مذکورہ آیت میں یہ حکم ہے کہ قوم کے یتامیٰ اور مساکین پر حکمت کے اصول کے مطابق خرچ کیا جائے۔ اس حکمت کی پیغمبر علیہ السلام نے اس طرح تعلیم فرمائی ہے کہ: ''ایک شخص نے آپؐ سے کسی چیز کا سوال کیا۔ آپؐ نے اس کو سوال کرنے سے منع فرمایا۔ اور اس کے پاس جو مختصر رقم تھی، اس سے اوزار خریدنے اور لکڑی کاٹ کر فروخت کرنے کا حکم دیا۔ وہ شخص آپؐ کے اس حکم کی تعمیل کے نتیجے میں خود کفیل ہو گیا۔'' (15)

اِنفاق کی دیگر مدّات

تیسرے درجے میں غیر قوم کے حاجت مند آزاد افراد ہیں، جیسے مسافر یا کوئی ضروری چیز کا سائل۔ یا پھر غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کی جائے۔ یہاں تک کہ اس انفاق میں کسی مسلمان کی تخصیص نہیں ہے۔ مشرک اور ذمی کفار پر بھی شریعت نے خرچ کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی حنفیؒ نے درجِ ذیل آیت کے تحت مذکورہ تحقیق کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ (272:2)

(تیرے ذمے نہیں ان کو ہدایت پر لانا۔ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ اور جو کچھ تم اپنے مال میں سے کسی پر خرچ کرتے ہو، اُس کا فائدہ تمہیں

کو ہوگا۔)

اس آیت کے حوالے سے امام ابوبکر جصّاص رازیؒ نے ایک باب ''باب لِاعطاء المشرک من الصدقۃ'' قائم کیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں جو مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد غیر مسلموں پر صدقہ کرنا ہے۔ اگر چہ وہ دین اسلام نہ بھی قبول کریں۔ سلف کی ایک پوری جماعت سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے کہا کہ: صدقہ صرف اپنے مسلمان بھائیوں پر کیا کرو۔ تو اللہ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی۔ چناں چہ پھر حضورؐ نے حکم فرمایا کہ: تمام ادیان کے لوگوں پر صدقہ کیا کرو۔'' (16)

الغرض مال اور دولت کو ایک جگہ جمع نہ کیا جائے، بلکہ اپنی ضروری حاجت سے زائد مال کو ضرورت مند انسانوں پر خرچ کرنا چاہیے۔ جب کسی قوم کا مال اور دولت کے سلسلے میں دستورُالعمل مذکورہ تصریحات کے مطابق ہوگا، تو وہ تباہی اور انقلاب سے بچ جائے گی۔ اگر کسی معاشرے کے چند افراد مال و دولت اور سرمایہ جمع کرنے پر جالگیں۔ اور حاجت مندوں کے معاملے میں بُخل سے کام لیں، تو یہ معاشرہ ایک نہ ایک دن ہلاکت اور بربادی کے ایسے گڑھے میں جا گرے گا، جس سے اُس کی نجات مشکل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ صالح اجتماعیت اور متوازن معاشرے میں سرمایہ داری کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ ایسے معاشرے کے لیے کوآپریٹو سوسائٹی (Co-operative Society) کی طرح ''مضاربت'' کے اصولِ اشتراکیت ضروری ہیں۔ اور ''مضاربت'' اس وقت ہوسکتی ہے، جب رِبا (سود) کو قطعی طور پر حرام قرار دیا جائے۔ اور لوگوں کو ہر قسم کے رِبا اور سودی معاملات اور مال و دولت کے اکتناز سے روک دیا جائے۔ کیوں کہ اِکتناز (زر کی ذخیرہ اندوزی) و اِحتکار (اشیا کی ذخیرہ اندوزی) سے سرمایہ داری نظام کو مدد ملتی ہے۔ اور سرمایہ داری نظام اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام اکتناز کی کسی بھی صورت کو برداشت نہیں کرتا کہ مال و دولت تقسیم ہونے کے بجائے سمٹ کر کسی مخصوص طبقے میں بند ہوجائے۔ اور اس طرح عوام مفلوک الحال ہوجائیں۔

اس ضمن میں سورۂ توبہ (آیت 34-35) میں یہ نص موجود ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿٣٤﴾ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ؕ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾

''اور جو لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اُن کو دردناک عذاب کی خوش خبری سناؤ!۔ آج اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلو اور پیٹھ کو داغ دیا جائے گا۔ یہ وہ ہے، جسے تم نے اپنے واسطے خزانہ بنا کر رکھا تھا۔ اور چکھو مزا اپنے خزانہ جمع کرنے کا۔''

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ مرحوم ''اِنفاق'' کے متعلق اس قسم کی آیات نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''ان آیات کی تفسیر میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جس مال سے زکوٰۃ اور دوسرے مالی فرائض ادا نہ کیے گئے ہوں، تو وہ مال احتکار و اکتناز کی فہرست میں شامل اور ''کنز'' سے متعلق وعید کا مصداق ہے۔ اور اس قسم کی دولت و ثروت کا نام سرمایہ داری ہے۔ اور یہ حرام اور باطل ہے۔ اور تباہ کرنے کے قابل ہے۔''(17)

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی نظر میں

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کی وہ خرابیاں جو معاشی عادلانہ نظام کو بگاڑتی اور خراب کرتی ہیں، ان سب کو اسلام میں ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ دلیل بڑی مدلل ہے:

''إعلم أنّ اللّٰہ تعالیٰ لمّا خلق الخلق، وجعل معایشھم فی الأرض، وأباح لھم الإنتفاع بما فیھا، وقعت بینھم المشاحۃ، و المشاجرۃ، فکان حکم اللّٰہ عند ذالک تحریم أن یزاحم الإنسان صاحبہ فیما اختصّ بہ، لسبق یدہ إلیہ. أو ید مورثہ، أو لوجہٍ من الوجوہ المعتبرۃ

عندهم، إلّا بمبادلة، أو تراضٍ معتمدٍ علىٰ علمٍ من غير تدليسٍ وركوبِ غررٍ." (18)

"جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا۔ اور زمین ان کی معاشی زندگی کے لیے سب کچھ سامان تیار کیا۔ اور اسے ان سب کے لیے مباح کر دیا، تو اس سے نفع حاصل کرنے میں لوگوں کے درمیان مزاحمت اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب کوئی شخص کسی شئے کو اپنے ہاتھ میں کرنے میں یا مورث کے قبضے کی وجہ سے اس کی وراثت میں آجائے۔ یا ان کے سوا دوسرے معتبر طریقوں سے ان کا قبضہ ہو جائے، تو ایسی صورت میں کسی دوسرے شخص کو اس کی مقبوضہ شئے میں مزاحمت نہیں کرنی چاہیے۔ بجز اس صورت کے کہ خرید و فروخت یا معتبر طریقوں سے باہمی رضا مندی سے معاملہ طے ہو جائے کہ دونوں کو اس کا صحیح علم ہو۔ اور اس میں دھوکے کو دخل نہ ہو۔"

شاہ صاحبؒ مزید آگے لکھتے ہیں:

"وَأيضاً لمّا كان النّاس مدنيّين بالطّبع لاتستقيمُ معايشهم إلاّ بتعاون بينهم، نزل القضاء بإيجاب التّعاوُن، وأن لاّ يخلو أحدٌ منهم ممّا له دخل في التّمدّن إلاّ عند حاجةٍ لايجد منها بُدًا." (19)

"اور نیز جب کہ انسان مدنی الطبع واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون و اشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراک کو واجب قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی واجب اور ضروری ہے کہ کسی کو بھی ایسی چیز سے الگ ہونے کا حق نہیں ہے، جو تمدّن میں داخل ہو۔ مگر کسی ایسی مجبوری کے وقت جس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔"

لیکن ایک بات یاد رکھی جائے کہ شریعت نے جو مالِ مباح سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، اس سے اکتناز و احتکار کی صورت میں ناجائز فائدہ حاصل نہ کیا جائے۔ کیوں کہ اس طرح ایک طرف سرمایہ داری کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے، جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اور دوسری طرف یہ دوسرے افراد کے لیے تنگیٔ معاش کا

سبب اور ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اس سے معاشرے اور تمدّن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

اس لیے شاہ صاحبؒ نے مالِ مباح سے فائدہ حاصل کرنے کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائیں۔ وہ یہ ہیں:

”و یشترط فی ذالک أن لا یضیق بعضهم علی بعضٍ بحیث یفضی إلٰی فساد التّمدّن.“ (20)

”اور مالِ مباح سے فائدہ حاصل کرنے کی یہ شرط ہے کہ ایک فرد، دوسرے فرد کے لیے معاشی تنگی کا باعث نہ بن جائے۔ اور اس طرح تمدن کو وہ فاسد کردے۔“

آخر میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

”فإن کان الإستنماء فیها بما لیس له دخل فی التعاون کالمیسر، أو بماهو تراضٍ یشبه الإقتضاب کالرّبا، فإنّ المفلس یضطرّ إلٰی إلتزام مالا یقدر علٰی إیفاءہ، ولیس رضاہ رضاً فی الحقیقة، فلیس من العقود المرضیّة، ولا الأسباب الصّالحة، وإنّما هو باطل، وسحت بأصل الحکمة المدنیّة.“ (21)

”ان تمام معاملات میں صحیح تعاون و اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں تعاون کو بالکل دخل نہ ہو، جیسا کہ جُوا۔ یا ایسے طریقے سے عمل میں آئے کہ بظاہر تعاون معلوم ہوتا ہو، لیکن وہ حقیقت میں زبردستی کا تعاون ہو تو یہ حقیقی تعاون نہیں ہوتا، جیسا کہ ربا کا کاروبار۔ اس لیے کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ایسی ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، جنھیں پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا۔ اور اس کی اس قسم کی رضامندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جاسکتی۔ اور نہ ان کو معاشیات کے اسبابِ صالحہ کہا جاسکتا ہے۔ بے شک اس قسم کے معاملات، حکمت و تمدن کی نظر میں باطل اور ظلم ہیں۔“

ایک شبہ اور اس کا جواب

مستشرقین کی طرف سے اسلام پر یہ سوال وارد کیا جاتا ہے کہ اسلام اموال سے نفع حاصل کرنے کو حرام قرار دیتا ہے۔ حال آں کہ ''سود'' یا ''ربا'' متاعِ تجارت میں نفع کی طرح ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مال و دولت سے نفع حاصل کرنا حرام ہوگا، تو انسانیت اپنی اجتماعیت اور اشتراکیت میں عالی اور بلند تمدن کی طرف کس طرح ترقی کر سکے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام مال سے انتفاع کی جملہ صورتوں کو حرام قرار نہیں دیتا۔ وہ تو صرف ایک خاص صورت کو حرام قرار دیتا ہے۔ جو یہ ہے کہ نفع اور نقصان، مال دار اور مزدور یا عامل میں مشترک نہ ہو۔ مثلاً مال دار تو نفع کا مالک ہوگا۔ اور نقصان عامل یا مزدور کو پہنچے تو اس کا نام ''رِبا'' یا ''سود'' ہے۔ کم یا زیادہ، یہ قطعاً حرام ہے۔ اس میں حیلے کی کوئی بھی صورت جائز نہ ہوگی۔ کیوں کہ سودی کاروبار سرمایہ داری کی بنیاد ہوتا ہے۔ باقی اس کو مالِ تجارت سے انتفاع کی طرح سمجھنا ایک دھوکہ ہے۔ عرب کے مشرک بھی اس طرح کہتے تھے کہ: ''اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا'' (275:2) یعنی ''بیع بھی تو رِبا کی طرح ہے۔'' اگر رِبا حرام ہے تو تجارت کو بھی حرام کہنا چاہیے۔

(2) قانونِ زکوٰۃ کی بحث اور اس کے ارتقائی مراحل

قرآنِ حکیم میں ''نماز'' اور ''زکوٰۃ'' کی ادائیگی کو اکثر ساتھ رکھا گیا ہے۔ اور ان دونوں کا ذکر اکٹھا آتا ہے۔ یہ دونوں اسلام کے عملی فرائض میں شمار ہوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی رُو سے ''نماز'' کے معنی ہیں، اس تجلی باری کی طرف متوجہ ہونا، جو کہ مقدس ملائکہ اور ارواحِ طیبہ کی مجلس (حظیرۃ القدس) پر پڑتی ہے۔ ''زکوٰۃ'' ایک خاص قانون کے تحت مال خرچ کرنے کا نام ہے۔

قانونِ زکوٰۃ کا پہلا مرحلہ

اسلام میں اس قانون کے دو درجے ہیں: پہلا درجہ مکہ میں تھا۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام ''عفو'' ہے۔ یعنی حاجت سے زائد مال کا انفاق یا خرچ کرنا۔ اس میں کسی خاص نصاب اور حصے کا تعین نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں اقامت

پذیر تھے تو (خلافتِ باطنہ کے حوالے سے تنظیمی) ''حکومتِ اجتماعیہ'' کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنے ماننے والوں سے زائد از حاجت مال کے انفاق کا مطالبہ کرے۔ اس انفاق میں اجتماعی حکومت نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اس کے لیے کوئی بیت المال نہیں تھا، جس میں اس قسم کے اموال جمع کیے جاتے۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کا لفظ مختلف سورتوں کی بتیس آیات میں آیا ہے۔ وہ سورتیں یہ ہیں: **البقرة، النساء، المائدة، الاعراف، التوبة، الكهف، مريم، الانبياء، الحجّ، المؤمنون، النّور، الروم، لقمان، الاحزاب، فصّلت، المجادلة، المزمّل، البيّنة۔**

ان سورتوں سے کچھ تو مکی ہیں اور کچھ سورتیں مدنی ہیں۔ زکوٰۃ کے مخصوص حصے کا تعین باتفاقِ علما، مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے مکی سورتوں میں جو زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، اس نے مفسرین کرام کو اس تاویل پر مجبور کیا ہے کہ ایسی سورتوں میں زکوٰۃ سے مراد صدقہ نفلی ہے۔ حال آں کہ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت تو مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی۔ اور حصے کا تعیُّن مدینہ منورہ میں ہوا۔

حقیقت وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی کہ شاہ صاحبؒ کے نظریے (خلافتِ باطنہ) کے مطابق مکہ مکرمہ میں (تنظیمی حوالے سے) اجتماعی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ مسلمان اپنے نزاعی معاملات کے تصفیے کے لیے پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور اجتماعی حکومت نے انفاق کے معاملے میں مسلمانوں کو خود ان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ کر اپنا نائب بنالیا تھا۔ معاشرے کو جتنی امداد کی ضرورت ہوتی تھی، اس کے مطابق مالی فرائض میں ان کو یہ حکم تھا کہ حاجت سے زائد مال ضرورت مندوں میں خرچ کیا جائے۔ مکہ مکرمہ میں قبل از ہجرت بیت المال کی کوئی صورت نہ تھی۔ مالِ غنیمت اور دوسرے ذرائع آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے حاجت کے مطابق انفاق کا حکم تھا۔

قانونِ زکوٰۃ کا دوسرا مرحلہ

ہجرت کے بعد یہ صورت بدل گئی۔ مالِ غنیمت آنا شروع ہوا، بیت المال بن گیا۔ بہ نسبت مکہ کے خوش حالی آ گئی۔ تو زکوٰۃ میں حدیث کی رو سے 1/40 حصہ کا تعیُّن ہوا۔

سورۂ بقرہ، اگر چہ مدنی ہے لیکن اس کی آیت نمبر 219 میں یہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ (219:2)

یعنی "اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ تم کہہ دو! کہ حاجت سے زائد مال کو خرچ کر دو!"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خرچ کی مقدار ذکر نہیں فرمائی۔ بلکہ زائد از حاجت کے انفاق کا حکم دے کر ان کی صواب دید پر چھوڑ دیا۔ تا کہ جہاد اور دوسری ضروریات کے معاملے میں ضرورت کو ملحوظ رکھیں۔ اور اپنی فہم و بصیرت سے کام لیں۔

مفتی محمد عبدۂ مصری "العفو" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"وهو الفضل والزيادة عن الحاجة، وعليه الأكثر. وقال بعضهم: أنّ العفو نقيض الجهد. أى ينفقون ماسهل وتيسّر لهم ممّا يكون فاضلاً عن حاجتهم وحاجة من يعولون." (22)

"عفو" کے معنی ہیں: "حاجت سے زائد مال"، اکثر علما کا یہی قول ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ عفو، جدو جہد کی ضد ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ ان کے لیے جو سہل اور آسان ہو، اس کو خرچ کریں۔ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حاجت سے زائد ہو۔"

اسلام کے ابتدائی دور میں، اس دستور پر عمل رہا کہ اجتماعی خوش حالی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ معاشرے کے ہر فرد کا معیشت میں مُساوی حق سمجھا جاتا تھا۔ وقت کے خلیفہ کا بھی بیت المال میں اتنا ہی حق ہوتا تھا، جتنا کہ ایک عام آدمی کا۔

ابو عبید کی "کتاب الاموال" میں خلیفہ عادل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت کے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ:

"اس مال (بیت المال) سے خلیفہ کے لیے کتنا لینا جائز ہے؟" سب نے مل کر کہا کہ اس کو اپنی ضرورت اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے لیے گزارہ لینا چاہیے۔ جس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اسی طرح اپنے اور اپنے اہل و عیال کے

لیے کپڑے لے۔ تقسیم مال میں خلیفہ کا سب کے برابر حصہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ:

''تمھارے مال (بیت المال) میں میرا اتنا ہی حق ہے، جس قدر کہ یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں۔ اگر مجھے حاجت نہ ہوگی تو کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق دوسروں کی طرح کھانے کے لیے لوں گا۔'' (23)

امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

''خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو اہلِ عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسا چھوڑوں گا کہ میرے بعد وہ کسی امیر کی محتاج نہ ہوں گی۔'' (24)

اسی ''کتاب الخراج'' میں ایک قصہ نقل کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان سے کہنے لگے:

''اگر تم چاہتے ہو کہ تم کو اپنے ساتھی (ابوبکرؓ) کی رفاقت نصیب ہو تو چاہیے کہ کُرتے کو پیوند لگا ہوا ہو۔ ازار خستہ ہو۔ جوتیوں میں پیوند ہوں۔ اور موزے بھی پیوند والے ہوں۔ اُمید کو کوتاہ کرو۔ اور کھانا بھی پیٹ بھر کر نہ کھاؤ۔ (25)

جس طرح خلیفہ عادل کے لیے بیت المال سے حاجت کے موافق مال لینے کی اجازت ہے اسی طرح حکومت کے اہل کاروں کے لیے بھی حاجت کے موافق بیت المال سے لینے کی اجازت ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''ثمّ إن كان الإمام لايستطيع بنفسه أن يباشر جباية الصدقات، وأخذ العُشور، وفصل القضاء في كلّ ناحيةٍ، وجب بعث العُمّال والقضاة. ولمّا كان أولئک لمشغولون بأمر من مصالح العامّة وجب أن تكون كفايتهم في بيت المال. (26)

''پھر جب کہ امام تنہا یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ صدقات اور عشر کو خود وصول کرے اور ہر طرف کے جھگڑوں کو خود فیصل کرے، تب ضروری ہوا کہ وہ عُمّال اور قُضاۃ کو ہر جگہ مقرر کرے۔ اور جب کہ قضاۃ اور عمال مصالح عامہ کی خدمت

میں مشغول رہتے ہیں، تو ضروری ہوا کہ ان کی معاشی ضرورت بھی بیت المال سے پوری کی جائے۔"

یہ حقیقت ہے کہ معاشرہ اور اجتماع کی سعادت، قومی فلاح اور بہبودی کا نام ہے۔ فرد کی سعادت اجتماع یا معاشرے کی سعادت میں پنہاں ہے۔ معاشرے کے جملہ حقوق اور منافع کو اسلام نے اجتماعیت اور اس کے افراد کے طبقات میں مشترک قرار دیا ہے اس لیے ہر فرد پر لازم ہے کہ معاشرے کی بھلائی کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔

اجتماعیت کی سعادت (کامیابی) نظامِ عدل سے وابستہ ہے۔ اور عدل کے قیام کے لیے کسی قانون کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح اجرامِ سماوی اور نظامِ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے "قانونِ تجاذب اور کشش" سے باہمی ربط قائم کیا ہے۔ اسی طرح انسانی اجتماع اور معاشرے کے باہمی انتظام اور ربط کے لیے "قانونِ احتیاج" بنایا ہے۔ جس میں ہر ایک فرد اپنی ضروریات میں دوسرے فرد کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی باہمی احتیاج کی وجہ سے معاشرہ وُجود میں آتا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کا مرتبہ بھی دین کے ایک اجتماعی رکن کا مرتبہ ہے۔ جس سے اجتماع کی بہتری اور اجتماعی مصلحتوں کا انتظام وابستہ ہے۔ صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اسلام میں جتنے بھی مالی تصرفات ہیں، ان سب کی حکمت، اسلامی اجتماع اور معاشرے کی دنیاوی بہتری اور فلاح ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سائنسی دور کی دنیا میں متمدن قومیں صرف ایک لمحے میں اپنی قومی برتری و ترقی کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کر رہی ہیں۔ لیکن امتِ مسلمہ کی اس طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

ہم نے جوئے اور رِبا کے متعلق تو یہ سمجھا ہے۔

"يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا" (276:2) (یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے۔)

تو کیا ہم پر یہ واجب نہیں ہے کہ ہم "وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ" (یعنی اللہ صدقات کو بڑھاتا ہے) کے مفہوم کو بھی سمجھیں!۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"ترکت فیکم أمرین، لن تضلّوا ماتمسّکتم بهما: "کتاب اللّٰه"

و"سنّة نبيّه". (27)

''میں نے تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک ان دونوں پر تمہارا عمل رہے گا تو تم کبھی گم راہ نہ ہوگے۔ ایک چیز ہے ''اللہ کی کتاب'' اور دوسری چیز اس کے ''نبی (علیہ السلام) کی سنت'' ہے''۔

اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "مسوّٰی" میں ذکر کیا ہے۔

پیغمبر علیہ السلام کی اپنی اجتماعی زندگی میں یہ سنت تھی کہ **"قُوْت لَایَمُوْت"** (روزی بقدرِ زندگی) پر کفایت کرتے تھے۔ اور اپنی پوری کوشش اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور خلق اللہ (اللہ کی مخلوق) کی تکالیف کو دور کرنے میں صرف کرتے تھے۔ انسانی اجتماع اور تمدن میں اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا کلمہ ہے: اقتصادی ضرورتوں میں عدل کا قیام۔ اس معنی میں سنت، معاشرے کی خرابی کی اصلاح کے لیے ایک نافع اور بہترین علاج ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا مؤقف

راقم السطور کے استاد علامہ عبیداللہ سندھیؒ رفاہیتِ بالغہ اور آرام پرستی کی افراط (زیادتی) کو حرام قرار دیتے تھے۔ اسی طرح اتنے کثیر اور وافر مقدار میں سرمایہ جمع کرنا بھی ان کے نزدیک حرام تھا، جو رفاہیتِ بالغہ یا حد سے زیادہ آرام پرستی کا موجب ہو۔ اور اس کی حرمت کو شراب کی حرمت سے بھی زیادہ مُضر سمجھتے تھے۔ یہ حرمت، قواعد کی حرمت نہ سہی، لیکن اَخلاقی حرمت میں تو کسی کو بھی شک نہ ہوگا۔ حضرت الاستاذ مرحوم کے پیشِ نظر پیغمبر علیہ السلام اور ان کے برگزیدہ ساتھیوں کی سیرت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ حرمت کی اہمیت تو اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب قوم کے اکثر افراد محتاج اور مالی وسائل سے محروم ہوں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ (7:57)

''جس مال میں اللہ (تبارک وتعالیٰ) نے تمہیں نائب بنایا ہے، اس میں سے محتاجوں پر خرچ کرتے رہو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے ہر مال میں (اپنا) نائب قرار دیا ہے۔ اصل ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ (33:24)

''اور تم حاجت مندوں کو اللہ کے اس مال سے دیا کرو، جس کو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے۔''

اس آیت میں بھی انسان کے مال کو اللہ کا مال بتایا گیا ہے اور اسے حاجت مندوں کی حاجت روائی اور ضرورت میں خرچ کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے یقیناً ان آیات پر عمل کر کے دکھایا۔ اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے یہ اسوۂ حسنہ کا درجہ رکھتا ہے۔ خلیفہ عادل فاروقِ اعظمؓ کے بارے میں مذکور ہے کہ سال کے آخر میں اپنے گھر کو جھاڑو دے کر خالی کرتے تھے تا کہ انسانی معاشرے کا کوئی بھی فرد محروم نہ رہ جائے۔ (28)

ایک شبہے کا ازالہ

مذکورہ تحقیق سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اگر معاشرہ اور اجتماع کا کوئی فرد کسی مادی چیز یا مال کو کسبِ حلال کے ذریعے حاصل کرتا ہے تو اس میں وہ تصرف کا حق نہیں رکھتا۔ یہ بات نہیں ہے۔ جو شخص اپنی محنت اور کسب سے کچھ حاصل کرتا ہے، اس میں تصرف کا بھی حق رکھتا ہے۔ کیوں کہ قبض سے ظاہری طور پر مِلک پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں تصرف کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں اجتماعی حقوق کی مخالفت نہ ہو۔ ورنہ اس سے ضرور باز پُرس ہوگی۔ کیوں کہ اس سے نیابت کے فرائض میں کوتاہی اور تقصیر لازم آئے گی۔ اس سے ارتکاز کی لعنت پیدا ہوگی۔ اور آہستہ آہستہ ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں دولت سمٹ کر آجائے گی۔ اور دولت کی صحیح تقسیم نہ ہوگی۔ عوام کے مُساویانہ حقوق ختم ہو جائیں گے۔ اس سے صرف چند خاندانوں کو عیش و عشرت کا ساز و سامان فراہم ہوگا۔



حوالہ جات وحواشی

1. حجة الله البالغه، من ابواب إبتغاء الرزق. ص: 641. طبع بیروت.
2۔ ایضاً۔
3۔ آبِ حیات، تالیف: مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ صفحہ: 86-185۔ مطبوعہ: مجتبائی، دہلی۔
4۔ اس آیتِ مبارکہ میں "خَلَقَ لَكُمْ" میں "كُمْ" جمع ہے۔ اور "مَا فِي الأَرْضِ جَمِيعًا" بھی جمع کے معنی میں ہے۔ اور یہ فقہی قانون ہے کہ جب جمع جمع کے مقابلے پر آتی ہے تو مساوات پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ دس آدمیوں سے یہ کہا جائے کہ: "یہ دس روپے تمہارے لیے ہیں۔" کہنے والے کی مراد کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر آدمی کے لیے مساوی طور پر ایک ایک روپیہ ہے۔ نہ کہ نو روپے ایک کے لیے اور ایک روپیہ باقی نو افراد کے لیے۔ اس آیتِ مبارکہ میں زمین کے تمام وسائل تمام انسانوں کے لیے رکھے گئے ہیں۔ یعنی ان وسائل میں تمام لوگوں کا مساوی حق ہے۔ (آزاد)
5. ایضاح الادلّه، تالیف: شیخ الهند مولانا محمودحسنؒ، صفحه 68. طبع دیوبند.
6. فیض الباری علی صحیح البخاری، ابواب الحرث و المزارعه. ص: 295. ج: 03. طبع: مجلس علمی، ڈابھیل. سورت. 1938ء.
7۔ شیخ مفتی محمد عبدہٗ لکھتے ہیں:

"إنّ هٰذه الجُملة هی نصّ الدّلیل القطعی علی القاعدة المعروفة عند الفقهاء: "أن الاصل فی الاشیاء المخلوقة الإباحة"، المراد بالإباحة الإنتفاع بها أکلاً و شربًا ولباسًا و تداویًا ورکوبًا وزینةً."

(یہ جملہ فقہا کے نزدیک مشہور اُس قاعدہ کلیہ پر قطعی دلیل اور نص کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: "پیدا شدہ اشیا میں اصل اباحت ہے۔" یعنی پیدا شدہ ان چیزوں میں سے تمام انسانوں کو کھانے، پینے، پہننے، دوا دارو کرنے، سوار ہونے اور زیب و زینت اختیار کرنے کا حق یکساں طور پر حاصل ہے۔)

(تفسیر المنار. تالیف: علامه رشید رضا. افادات: شیخ مفتی محمدعبدهٗ. جلد: 1، صفحه: 24، طبع: دارالمنار 1373ھ)

8. أحکام القرآن تالیف، أبو بکر بن العربی. جلد1، صفحه 10، 11. طبع: بیروت.
9. محلّٰی. تالیف: علامه ابن حزمؒ. جلد: 2. صفحه 157-158. طبع: دارلجیل، بیروت.
10۔ ایضاً۔ ص: 158۔

11۔ ایضاً۔

12۔ ایضاً۔

13. احکام القرآن. تالیف: امام ابوبکر جصاص رازیؒ. جلد: اول. ص: 131. طبع: سہیل اکیڈمی، لاهور.

14۔ امام ابوبکر جصّاص رازیؒ نے اپنی دو اسناد کے ذریعے سے حضرت علیؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نسخت الزّكٰوة كلّ صدقة" (کہ زکوٰۃ کے وجوب نے باقی تمام صدقات کو منسوخ کردیا ہے۔) امام رازیؒ نے اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ: اگر یہ حدیث کو مرفوع حدیث مان بھی لیا جائے تو زکوٰۃ سے منسوخ ہونے والے صدقات سے مراد ایسے صدقات ہیں، جو زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے واجب تھے۔ مثلاً سورۃ النساء کی آیت نمبر 08 کے مطابق مالِ وراثت کی تقسیم کے وقت اگر رشتے دار حاضر ہو جائیں تو ان کو ایک حصہ دینا واجب تھا۔ زکوٰۃ کے حکم سے یہ حصہ منسوخ کردیا گیا۔ یہ نہیں کہ دیگر صدقاتِ واجبہ بھی زکوٰۃ سے منسوخ ہوگئے ہیں۔ جیسا کہ صدقہ فطر کا وجوب زکوٰۃ کے حکم کے بعد ہوا ہے۔ جو آج بھی واجب ہے۔ اور جہاں تک ہم نے اُن حقوقِ واجبہ کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ رشتے دار کما نہ سکتے ہوں تو اُن پر خرچ کرنا واجب ہے اور مجبور اور مفلس کے کھانے کا بندوبست کرنا وغیرہ، یہ زکوٰۃ کی فرضیت کے باوجود بھی حقوقِ واجبہ میں داخل ہیں۔

(دیکھئے! احکام القرآن. تالیف: امام ابوبکر جصّاص رازیؒ. جلد: اول۔ ص: 132۔ طبع: سہیل اکیڈمی، لاہور)

15۔ یہ حدیث سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں روایت کی گئی ہے۔ (دیکھئے سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: 1641۔) اور مشکوٰۃ شریف میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ (دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح۔ جلد نمبر: 02۔ حدیث نمبر: 1851۔ طبع: بیروت۔)

16. احکام القرآن. تالیف: امام ابوبکر جصاص رازیؒ. جلد: اول. ص: 461. طبع: سہیل اکیڈمی، لاهور.

17۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ تالیف: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ۔ صفحہ: 53۔ طبع: ندوۃ المصنفین، دہلی۔

18. حجة الله البالغه، ابواب ابتغاء الرزق. تالیف: امام شاه ولی اللهؒ. جلد2، ص: 640. طبع: بیروت.

19۔ ایضاً۔

20۔ ایضاً۔

21۔ ایضاً۔

22. تفسیر المنار. تالیف: علامه رشید رضا مصری. افادات: مفتی محمدعبدهٔ. جلد: 2.

ص: 227. طبع: دارالمنار، مصر.

23. كتاب الاموال. تاليف: ابوعبيد قاسم بن سلامؒ. ص: 266. طبع: دارالكتب العلميه، بيروت.

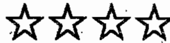
24. كتاب الخراج. تاليف: حضرت امام ابويوسفؒ. ص: 27. طبع: بيروت.

25۔ ایضاً۔ص: 15۔

26. حجة الله البالغه. امام شاه ولى الله دهلوىؒ. ابواب سياست المدن. جلد: 2. صفحه: 740. طبع: بيروت.

27۔ اس حدیث کو امام مالکؒ نے ''مؤطا'' مرسلاً روایت کیا ہے۔(دیکھئے! مؤطا امام مالکؒ۔ حدیث نمبر: 2618۔ طبع: بیروت۔) اور مشکوٰۃ شریف میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔(دیکھئے! مشکوٰۃ المصابیح۔ حدیث نمبر: 186۔ طبع: بیروت۔)

28. حروف اوائل السور. تاليف: علامه موسىٰ. ص: 134. مطبوعه: بهوپال.



فصل سوم

اسلام کا نظریۂ معیشت اور جاگیرداری نظام کی خرابی

ایسے معاشرے کو درست کرنے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے چند اقتصادی اصول بیان فرمائے ہیں۔ چناں چہ ان کی تالیفات "بدورِ بازغہ"، "حجۃ اللّٰہ البالغہ"، "تفہیماتِ الٰہیہ" اور "خیر کثیر" سے اُردو میں کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے اصل کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اقتصادی اصول

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

1۔ زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ باشندگانِ مُلک کی حیثیت مسافر خانے میں ٹھہرنے والوں کی ہے۔

2۔ وہ نظامِ زندگی، جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش وعشرت کی وجہ سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد ختم کر کے عوام کو مساویانہ نظامِ زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا جائے۔

3۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک وقوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

4۔ قوم کا عیش پسند طبقہ، قوم کے لیے بھاری بوجھ بن جاتا ہے۔

5۔ محنت کشوں کی کمائی پر نہ کمانے والوں کا قبضہ، انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

6۔ جو معاشرہ اپنے عوام کی بنیادی ضرورتوں کا کفیل نہ ہو، اس کا برباد ہونا ہی بہتر ہے۔

7۔ قوم کے بڑے لوگوں کا دنیوی لذتوں میں منہمک ہونا، سماج کے لیے مہلک مرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

8۔ طبقہ واریت اسلام کی روح کے خلاف ہے۔
9۔ انسانی فرد کی تین بنیادی ضرورتوں: خوراک، لباس، مکان کا سب سے پہلے پورا ہونا ضروری ہے۔
10۔ جس معاشرے میں لوگوں کے لیے کھانے پینے کا پورا بندوبست نہ ہو، اس کے افراد کی اَخلاقی حالت گر جاتی ہے۔ اور ان کی دماغی اور ذہنی کیفیت پست ہوجاتی ہے۔
11۔ اعتدال پسندی اور متوسط رفاہیت، معاشرے کے لیے اہم چیز ہے۔
12۔ ہر شخص کے لیے رہنے کی جگہ ایسی ہونی چاہیے، جس میں سردی اور گرمی سے بچاؤ اور خاندان کے افراد و اسباب کی حفاظت ہو۔ اس کا طول و عرض کشادہ، فضا وسیع اور اُونچائی متوسط ہو۔ اور یہ اسے آسانی سے میسر ہو۔
13۔ انسان کا کمال اور خوبی اس میں ہے کہ وہ ارتفاقات (معاشرے کی ترقی کے اصول) پر چلے۔ اور اقترابات (روحانی ترقی کے اصول) سے فائدہ اٹھائے"۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر؛ قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مذکورہ حکیمانہ تعلیم اور فکر، اصل میں قرآن مقدس کی مقدس تعلیم کا نچوڑ ہے۔ یہ حقیقتِ مُسلّمہ ہے کہ قرآن حکیم انسانیت کے لیے ایسا جامع فکر پیش کرتا ہے، جس سے انسان کو معاشی مصائب سے رہائی مل جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ خداپرستی کی راہ بھی کھل جاتی ہے۔ اور اس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتے ہیں۔ اسلامی اجتماعیت اور مادی اشتراکیت میں یہی ایک حدِ فاصل ہے کہ مادی اشتراکیت انسانیت کے لیے صرف ایک مادی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ لیکن اسلامی اجتماعیت انسان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کا پیغام ساتھ لاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے اس فکر کے متعلق راقم کے استاذ حضرت علامہ عبیداللہ سندھیؒ کا یہ وضاحتی اشارہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"قرآنِ حکیم انسانیت کی ترقی کے لیے ایک ایسا صالح فکر پیش کرتا ہے۔ جس میں انسانیت کے سب پہلو آجاتے ہیں۔ اس کے ذریعے انسانی سوسائٹی کی

معاشی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اور معادی (آخرت کی) تیاری بھی۔ اس فکر کو ماننے والی جماعت دنیا میں سر بلند ہو کر انسانی سوسائٹی میں عدل قائم کرتی ہے۔ وہ غریبوں اور بے کسوں کی ہر قسم کی انسانی ضرورتیں پوری کرنے کا ذمہ لیتی ہے۔ اور انہیں تمام معاشی مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ تاکہ انسان کا خدا تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے۔

اس انصاف اور خدا پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں اس کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ترقی میں کوئی رُکاوٹ نہیں آتی۔ یہ جماعت اپنی ذمہ داری اس لیے اپنے سر لیتی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ انسانیت کی یہ خدمت خدا پرستی کا جزو ہے۔ اور خدا پرستی کا لازمی نتیجہ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس خدمت کا بدلہ دنیا کے مال و دولت یا عزت کی شکل میں لینا اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتی۔

اب اگر کوئی سرمایہ پرست جماعت اس سرمایہ شکن فکر کو اپنے سرمایہ پرستانہ فائدوں کے خلاف پا کر اس فکر کو فنا کرنے کی کوشش کے لیے اُٹھے تو سرمایہ شکن قرآنی جماعت کی اصطلاح میں اسے "کافر" کہا جاتا ہے۔ اور یہ قرآنی جماعت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ کافر گروہ کے ہاتھ سے طاقت چھین کر اسے اتنا کمزور کر دے کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔ قرآنِ حکیم کافروں سے جنگ اس لیے ضروری قرار نہیں دیتا کہ وہ اس کے فکر کو نہیں مانتے۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ طاقت پیدا کر کے لوگوں کو انسانیت کے راستے پر چلنے سے نہ روکیں۔ جس کی دعوت قرآن دیتا ہے۔ اور اپنے راستے پر چلنے کے لیے کسی کو مجبور نہ کر سکیں۔" (1)

معاشرے کا ہر فرد محنت کر کے کھائے

اسلام کے بتائے ہوئے صالح معاشرے کے ہر فرد کے لیے ہاتھ کی کمائی سے کھانا اور محنت مزدوری سے اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ اگر کچھ افراد ہاتھ کی کمائی اور محنت مزدوری کو چھوڑ کر دوسروں کی کمائی پر نظر جما کر بیٹھ جائیں، تو ایسا معاشرہ صالح نہیں کہلاتا۔ اور جس حکومت کی بنیاد ایسے ناقص معاشرے پر ہو گی، تو ایسی

حکومت بھی ایک نہ ایک دن تباہ و برباد ہو کر رہے گی۔ اور مفت خور بھی اپنا بُرا انجام دیکھیں گے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس کی صراحت کرتے ہوئے اپنی مشہورِ عالم تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں:

''اور اس دور میں حکومت کی بربادی کا غالب سبب دو باتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بیت المال (خزانے) پر مفت خوروں نے بوجھ ڈال دیا ہے۔ بعض ان میں سے اپنے آپ کو غازی اور مجاہد سمجھ کر بیت المال سے مال اُڑانے کے عادی ہو گئے۔ اور بعض اپنے آپ کو علما کی حیثیت سے خزانے کا مستحق جانتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں، جن کو اپنے انعام و اکرام سے نوازنا اور ان کو بخشش اور صلہ دینا سرمایہ داروں کی عادت ہوتی ہے۔ جیسے زاہد اور درباری شعرا۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کو بھکاری کہنا مناسب ہے۔ ان کا مقصد صرف مال جمع کرنا اور اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ معاشرے کی ضرورت اور مصلحت ان سے پوری ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور پھر آپس میں ایک دوسرے کے لیے معاشی ناہمواری کا باعث بنتی ہے۔ اور آخر میں یہ لوگ شہر اور معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسان، تُجّار اور صنعت کار پر حکومت نے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں۔ اور ان کے وصول کرنے میں ان پر سختی اور تشدد رَوا رکھتی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ حکومت کا وفادار طبقہ بھی ان ٹیکسوں کے بوجھ کے نیچے دبتا اور پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف ایک اور فریق ہے۔ اس نے اس ناجائز تشدد سے تنگ آ کر بغاوت کی راہ اختیار کی ہے۔ بہر حال معاشرے کی بھلائی اس میں ہے کہ کم ٹیکس لگایا جائے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال رکھا جائے۔''(2)

مذکورہ کتاب میں اس قسم کی ایک اور عبارت سرمایہ دارانہ نظام میں ناکارہ معاشرے کے متعلق آئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''ملک کی اکثریت خلیفہ کی عیال بن جاتی ہے۔ کبھی وہ یہ کہہ کر رقم وصول کرتے ہیں کہ وہ غازی ہیں۔ اور ملک کے سیاسی مدبّر ہیں۔ اور اس سے ان کا کسی ضروری حاجت کو رفع کرنا مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ باپ دادا کی (مفت خوری والی) رسم کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ کہہ کر خزانے پر بوجھ بن جاتے ہیں کہ وہ درباری شاعر ہیں۔ بادشاہوں کی تو یہ عادت رہی ہے کہ شعرا کو انعام و اکرام دیا کرتے ہیں۔ اور کبھی اپنے کو زاہد اور درویش ظاہر کر کے مانگتے پھرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی تنگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور ان کی کمائی صرف بادشاہوں (سرمایہ داروں) کی صحبت، ان کی چاپلوسی اور مدح سرائی پر منحصر رہ جاتی ہے۔ اور آخر کار یہ ایسا فن بن جاتا ہے کہ ان کے تمام افکار اسی میں لگے رہتے ہیں اور اسی میں ان کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں اس قسم کے اشغال بڑھ جاتے ہیں تو لوگوں میں گھٹیا خیالات اور پست افکار پیدا ہوتے ہیں اور وہ اخلاقِ صالحہ سے منہ موڑ لیتے ہیں''۔ (3)

ذریعہ پیداوار

معاشرے کے معاشی نظام کی بہتری کا مدار ذرائع پیداوار پر بھی ہے۔ اور اس کا نہایت اہم ذریعہ زمین ہے۔ قرآنِ مجید میں زمین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ (10:7)

''ہم نے زمین میں تم کو حکومت دی۔ اور زمین ہی میں تمہارے لیے سامانِ معاش رکھا۔''

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ (10:55)

''اور زمین کو حق تعالیٰ نے عام انسانوں کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔''

شاہ صاحبؒ بنیادی معاشی وسائل میں سے زراعت کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ جس ملک میں اس کے وسائل موجود ہوں، اس جگہ اگر اس سے بے پروائی برتی جائے تو اس ملک کی تمدّنی حالت کبھی درست نہیں رہ سکتی۔ اور اس کا فاسد اور برباد رہنا یقینی ہے۔ کیوں کہ خام اجناس کی پیداوار کے بغیر نہ تجارت چل سکتی ہے۔ اور نہ صنعت و حرفت

بروئے کار آسکتی ہے۔ (4)

چناں چہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''پس اگر باشندگانِ ملک کی اکثریت صنعت و حرفت اور شہری سیاسیات ہی میں مصروف رہے۔ اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیاوی مدنی زندگی فاسد اور خراب ہوجائے گی۔'' (5)

اور آگے چل کر زراعت، تجارت اور صنعت کو مدنی حیات کا اہم جزو قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی اختیار کر لیتی ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ سربلندیوں اور مسرفانہ رفاہیت میں باہمی مقابلے کو معیارِ حیات بنالیتی ہیں تو وہ کبھی مدنی زندگی میں پھل پھول نہیں سکتیں۔ اور ان کی یہ غیر طبعی عیش کوشی ان کو جلد ہی لے ڈوبتی ہے۔'' (6)

"فإذا أقبل جمٌّ غفيرٌ منهم إلٰى هٰذه الأكساب أهملوا مثلها من الزّراعات والتّجارات، وإذا اتّفق عظماء المدينة فيها الأموال أهملوا مثلها من مصالحَ المدينة، وجرّ ذالك إلٰى التّضييق على القائمين بالأكساب الضرورية كالزّرّاع، و التّجّار، و الصّنّاع، و تضاعف الضّرائب عليهم، و ذالك ضرر بهذه المدينة يتعدّٰى من عضو منها إلٰى عضو، حتّٰى يعمّ الكلّ، و يتجارٰى فيها كما يتجارٰى الكلب في بدن المكلوب." (7)

''پس جب باشندگانِ ملک کی بڑی اکثریت اس قسم کے (غیر طبعی اور غیر مفید) کسب و اکتساب میں منہمک ہوجاتی ہے تو زراعت اور تجارت جیسے کسب و ہنر چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اور جب شہر کے رؤسا اور امرا ایسے غلط وسائل معیشت پر خرچ کرتے ہیں، تو ایسے لوگ مدنی مصالح کو برباد کر دیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ یہ غلط انہماک ان لوگوں کی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ جو اہم اور ضروری

معاشی وسائل کی جانب مشغول ہیں۔ مثلاً کاشت کار، تجار اور صناع۔ نیز یہ فاسد انہماک ان پیشہ ور افراد پر بھاری ٹیکسوں کا باعث ہوجاتا ہے۔ اور یہ مدنی زندگی کے لیے اس قدر نقصان دہ بن جاتا ہے کہ اعضائے جماعت کے ایک عضو (فرد) سے متعدی ہو کر دوسرے عضو (فرد) تک پہنچتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ تمام اعضا (افراد) جماعت میں "دَاءُ الْكَلْبِ" کی طرح متعدی ہو جاتا ہے۔"

جاگیرداری اور زمین داری سسٹم کی خرابیاں

زمین کی پیداوار کی اہمیت کے بعد ''زراعت'' کی شرعی اہمیت سمجھنی بھی ضروری ہے۔
زراعت دو طرح کی مروّج ہے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص زمین کو خود کاشت کرے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنی زمین کو بٹائی کے طور پر دوسرے کو کاشت کے لیے دے دے۔ اس دوسری صورت کو شرعی اصطلاح میں ''مزارعت'' کہا جاتا ہے۔ ملک میں اس کی جو ظالمانہ روش جاری ہے، جس میں کسان یا ہاری پر بے حد مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور کسان زمین دار کا غلام بن جاتا ہے، اسے درست تسلیم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی مزارعت کی وہ صورت، جو اسلام کے قرنِ اول میں رائج تھی، اس کا بھی حکم سُن لیجیے!

مزارعت کے سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کی روایات

''مسند امام ابوحنیفہؒ'' میں ''کتاب المزارعۃ'' کے تحت دو روایتیں درج ہیں۔ ایک حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور دوسری حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے۔ ان دونوں روایتوں میں زمین داری کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ احادیث اور ان کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

[۱] "أبوحنيفة، عن أبي الزبير، عن جابرؓ (بن عبدالله) قال:
"نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المخابرة."

''ابوحنیفہؒ ابوالزبیرؒ کے واسطے سے حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا۔"

''مزارعۃ'' اور ''مخابرۃ'' یہ دو قریب المعنیٰ لفظ ہیں۔ اور زمین کو زرعی کرائے پر دینے کی

دو شکلیں ہیں:

1۔ مزارعہ: یہ کہ پیداوار کے کسی حصے کے عوض میں مثلاً نصف یا تہائی یا چوتھائی کے بدلے میں زمین کرائے پر دی جائے۔ اور بیج مالکِ زمین کا ہو۔

2۔ مخابرہ: میں بھی یہی صورت ہوتی ہے، مگر اس میں بیج عامل یا کاشت کار کا ہوتا ہے۔

اراضی زرعی کرائے پر دینے کی یہ ہر دو صورتیں امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک اس اور اس نوعیت کی دیگر احادیث کے تحت ناجائز ہیں۔

[۲] "أبوحنيفه، عن أبي حصين، عن رافع بن خديج، عن النبيّ صلّى اللّٰه عليه و سلّم: أنه مرّ بحائطٍ فأعجبه، فقال: لمن هٰذا؟ فقلت: لي. فقال: من أين هو لك؟ قلت: إستاجرته قال: فلا تستأجره."

''امام ابوحنیفہؒ بوساطت ابی حصین، حضرت رافع بن خدیج ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک باغ پر گزر ہوا، جو آں جنابؐ کو بہت پسند آیا۔ آپؐ نے فرمایا: یہ کس کا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ میرا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے اس کو اجارہ (کرائے) پر لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ: اس کی پیداوار کے کسی حصہ کے عوض اجارے پر نہ لینا۔''

[۳] "وفي رواية أنّ النبيّ صلّى اللّٰه عليه و سلّم مرّ بحائطٍ، فقال: لمن هذا؟ قلتُ: لي، و قد استاجرته. فقال: فلا تستأجره."

''اور ایک روایت میں یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ پر گزرے تو آپؐ نے فرمایا کہ: یہ کس کا ہے؟ (حضرت رافعؓ کہتے ہیں) میں نے کہا یہ میرا ہے۔ اور میں نے اس کو اجارے پر لیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کو اجارے پر نہ لے''۔(8)

مزارعت کے بارے میں امام مسلمؒ کی روایات

امام مسلم نیشاپوریؒ اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی روایت کو

متعدد طریق سے لائے ہیں۔ مسئلے کی وضاحت کے لیے چند روایات پیش کی جاتی ہیں:

[۱] "عن جابرؓ بن عبداللّٰہ، قال: نھیٰ رسو ل اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عن کراء الأرض."

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔"

[۲] "عن جابرؓ، قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: مَن کانت لہ أرض فلیزرعھا، فإن لم یزرعھا، فلیزرعھا أخاہ."

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس کے پاس زمین ہو تو اس میں خود کاشت کرے۔ اور اگر خود کاشت نہیں کرتا تو اپنے بھائی کو (بلاعوض) کاشت کے لیے دے دے۔"

[۳] "عن جابرؓ بن عبداللّٰہ، قال: کان لرجل فضول أرضین من أصحاب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم، فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: من کانت لہ فضل أرض فلیزرعھا، أولیمنحھا أخاہ، فإن أبیٰ فلیمسک أرضہ."

"حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے ایک کے پاس زائد زمین تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر کسی کے پاس زائد زمین ہو تو خود کاشت کرے۔ یا اپنے بھائی کو دے دے۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو اپنی زمین کو (اپنے پاس) روکے رکھے۔"

یہ ایک قسم کی تہدید ہے۔

[۴] "عن جابرؓ، قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: من کانت لہ أرض فلیزرعھا، فإن لم یستطع أن یزرعھا، وان عجز عنھا، فلیمنحھا أخاہ المسلم، ولایواجرھا إیاہ." (9)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: جس کے پاس زمین ہو تو اس میں خود کاشت کرے۔ اور اگر خود

کاشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور عاجز ہے۔ تو اپنے مسلمان بھائی کو یہ زمین (مفت) دے دے۔ اور اس زمین کو اجارے پر نہ دے۔"

زمین داری ائمہ کی نظر میں

زمین کو بٹائی پر دینے کی جو مروّجہ صورت ہے، اس کو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تینوں ناجائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ ایک صورت ایسی ہے، جس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نقد رقم لے کر زمین کو کرائے یا ٹھیکے پر دیا جائے۔ اس میں زمین کی پیداوار کی تقسیم نہیں ہوتی۔ حضرت حسن بصریؒ نے اُس کو بھی ناجائز قرار دیا۔ اور امام طاؤسؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ جیسا کہ امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ (10)

امام مالکؒ نے اس سلسلے میں ایک روایت حضرت رافع بن خدیجؓ سے اس طرح ذکر فرمائی کہ پیغمبر علیہ السلام نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا۔

"حضرت حنظلہ بن قیس جو حضرت رافعؓ سے یہ روایت کرتے، کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت رافعؓ بن خدیج سے پوچھا کہ: کیا سونے اور چاندی کے عوض پر بھی زمین کو کرائے پر دینا ناجائز ہے؟ حضرت رافع نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔" (11)

زمینداری کی مروجہ صورت کو امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دو شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ جائز قرار دیتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس اختلاف کی قدرے وضاحت کردی جائے۔

علامہ سمرقندی (وفات 539ھ) اپنی مشہور تالیف "تحفة الفقهاء" میں فرماتے ہیں:

"المزارعة: عبارةٌ عن عقد الزّراعة ببعض الخارج. وكذا المعاملة: هو إجارة العامل ليعمل فى كرمهٖ، و أشجارهٖ، من السقى، والحفظ ببعض الخارج. فقال أبو حنيفة: كلتاهما فاسدتان، غير مشروعتين. وقال أبويوسف و محمّد: كلتاهما مشروعتان." (12)

"مزارعت": نام ہے زمین کو بٹائی پر دینے کا معاملہ کرنا۔ اور "معاملہ" بھی

اسی طرح ہے، اس میں انگور اور دوسرے پھل دار درختوں کی حفاظت اور پانی دینے کے لیے مزدور اس کرائے کے عوض لیا جاتا ہے کہ باغ کے پھلوں کا ایک مقرر حصہ اس کو ادا کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ دونوں صورتوں کو ناجائز اور غیر مشروع قرار دیتے ہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کہ دونوں صورتیں جائز اور مشروع ہیں"۔

ملک العلما علامہ ابو بکر بن مسعود کا سانیؒ نے اپنی مشہور عالم تالیف "البدائع والصنائع" میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے استدلال کا مدلل جواب دیا ہے۔

علامہ کا سانیؒ لکھتے ہیں کہ:

"امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے مزارعت کے جواز میں خیبر کے معاملے سے استدلال کیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے یہودِ خیبر کو باغات معاملے کے طور پر اور اس کی اراضی مزارعت کے طور پر دیے تھے، پیغمبر علیہ السلام کے فعل سے کم از کم جواز تو معلوم ہوگیا۔ اور دوسرے یہ کہ سلف اور خلف کا اس پر تعامل رہا ہے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہ فرمان ہے کہ خیبر کا معاملہ "مزارعت" نہیں تھا بلکہ یہ جزیہ تھا جو ان سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور اس کو مزارعت پر حمل کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے یہ فرمایا کہ "أُقِرّکم ما أقرّکم اللّٰہ" یعنی "میں اس وقت تک تم کو ان اراضی پر رکھتا ہوں، جب تک اللہ تم کو رکھے"۔ اس میں تو مدت کی لاعلمی ہے۔ معاملے کی کوئی مقرر مدت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو بالاتفاق ناجائز کہنا چاہیے۔ کیوں کہ مزارعت میں جب معین مدت نہ ہوگی تو بالاتفاق ناجائز ہے۔

باقی سلف و خلف کا تعامل اور کسی کا انکار نہ کرنا اس سے بھی جواز پر دلیل لینا صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سکوت اس لیے تھا کہ یہ مسئلہ اجتہادی نوعیت کا تھا۔ (13)

جاگیرداری کے بارے میں محققین کی آرا کا خلاصہ

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ نے ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کے آخر میں جاگیرداری نظام کے بارے میں محققین اسلام کی آرا جمع کی ہیں۔ اور برعظیم پاک و ہند کی زمینوں کے شرعی احکامات کی نشان دہی کی ہے۔ اور اسلام کے اقتصادی نظام کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ چناں چہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ہندوستان میں اگر صحیح معاشی نظام کو بروئے کار لایا جائے تو اس سلسلہ میں دو وسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں: ایک ''سود کا مسئلہ'' اور دوسرا ''بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا مسئلہ''۔ اس لیے کہ ان دونوں ہی مسئلوں کے ساتھ باشندگانِ ہند کا بہت گہرا تعلق موجود ہے۔ خصوصاً مسئلہ سود تو اس درجہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کے اکثر و بیش تر مسلم و غیر مسلم آبادی کی معاشی بدحالی و فاقہ مستی کا یہی واحد اجارہ دار ہے۔ اور اس کے بعد ان بڑی بڑی زمین داریوں اور تعلقہ داریوں کی وجہ ہے۔ جن میں کاشت کار کو اسلام، اخلاق اور انصاف کے خلاف غلام سمجھا جاتا اور غلاموں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ اور جو عوام کی معاشی تباہی کے لیے جونک کا کام کررہی ہے۔ اور نہ صرف یہ، بلکہ شریعتِ اسلامی کے اہم قانونِ وراثت کے خلاف مجرمانہ جرأت کے ساتھ یہ زمین دار اور تعلقہ دار سرکاری عدالتوں میں یہ بیان دیتے چلے آئے ہیں کہ ہم اپنی ''اسٹیٹ'' اور اپنے ''تعلقہ'' کی وراثت کے مسئلے میں ''اسلامی قانون'' پر ''رسم ورواج'' کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور تقسیمِ وراثت کا انکار کرتے ہوئے اسٹیٹ اور تعلقہ سے متعلق رسم ورواج کے قانون کو واجب العمل یقین کرتے ہیں۔

اس لیے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ معاشی نظام میں نہ ''سود'' کے لیے کوئی گنجائش ہے اور نہ ''ذاتی اسٹیٹ'' اور ''تعلقہ'' کے موجودہ سسٹم کے لیے کوئی گنجائش ہے۔

ان ہر دو مسائل میں سے ''سود'' تو ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی قباحت و شناعت واضح اور عام طور پر مسلّم ہے۔ اور معاشی نظام میں اس کی تباہ کاریاں روشن و ظاہر ہیں۔ البتہ بڑی بڑی زمین داریوں کے موجودہ سسٹم کی قباحت و شناعت میں ''شخصی ملکیت'' کا مسئلہ حائل ہوجاتا ہے۔ اور اس کے لیے اس کے خلاف اقتصادی نظام کا اقدام نہ صرف غیر مسلم کی

نگاہوں میں کھٹکتا ہے، بلکہ خود مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں، جو احکامِ اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر اس اقدام کو غیر اسلامی سمجھتے اور کمیونزم یا سوشلزم کی کورانہ (اندھی) تقلید جانتے ہیں۔ اس لیے از بس ضروری ہے کہ اس مقام پر علمائے اسلام کے وہ چند فتاویٰ یا اسلامی فیصلے پیش کر دیے جائیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر عامۂ مسلمین کی فلاح و بہبود کا تقاضا ہو تو امام اور امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفتوحہ ملک کی اراضی کو ''شخصی مِلک'' بنانے کی بجائے بیت المال اور حکومت (خلافت) کی مِلک قرار دے۔

برِعظیم پاک و ہند کی زمینوں کے بارے میں علمائے اسلام کے فتاویٰ

علمائے اسلام کے یہ فتاویٰ مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیرِ تحریر آئے ہیں کہ ''اراضی ہند'' اشخاص و افراد کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ وقفٌ للمسلمین (مسلمانوں کے لیے وقف ہونے) کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں، اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں ''ارض المملکه'' یا ''ارض الحوزہ'' کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''ارضِ عراق'' کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا۔ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر کے آئندہ کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کی رائے

چناں چہ شیخ جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ (13) نے ایک مستقل رسالہ ''تحقیق اراضی'' (14) کے نام سے اسی غرض سے تصنیف فرمایا کہ ''اراضی ہند'' شخصی ملک نہیں بلکہ ''ارضِ مملکت'' اور ''وقف للمسلمین'' (مسلمانوں کے لیے وقف) ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں، شیخ فرماتے ہیں:

''والحجّة لعلمائنا فی التقریر، تقریر أمیر المؤمنین عمرؓ لسواد عراق بموافقة من الصحابة رضوان الله علیهم أجمعین.

فی ''الهدایة'': فی ''باب الغنائم'': و إذا فتح الإمام بلدة عنوة أی قهرًا فهو بالخیار إن شاء قسّمه مابین المسلمین، کما فعل رسول الله

صلّی اللّٰه علیه و سلّم بخیبر. و إن شاء أقرّ أهلهُ علیه، و وضع علیهم الجزیة، و علٰی أراضیهم الخِراجِ، کذالک فعل عُمرؓ لِسواد العراق بموافقة من الصحابة رضوان اللّٰه علیهم أجمعین ولم یحمد من مانعه و فی کلّ ذالک قدوة فیتخیّر. (15)

''(خلیفہ کا مُلک کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ میں باقی رکھنا اور اس کی ملکیت کو حکومت کی قرار دینا ''تقریر'' کہلاتا ہے) اور ''تقریر'' کے متعلق ہمارے علما (اَحناف) کی دلیل حضرت عمرؓ کی وہ ''تقریر'' ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی موافقت کے ساتھ سوادِ عراق کے متعلق ان سے عمل میں آئی۔

''ھدایه'' کے ''باب الغنائم'' میں ہے کہ گر امام کسی شہر کو قہر و غلبے کے ساتھ فتح کرے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس کی اراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کر دے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا۔ اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضے میں اس کو رہنے دے۔ اور اس پر جزیہ مقرر کر کے ان کی زمینوں پر خراج مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کی موافقت کے ساتھ کیا۔ اور جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند سمجھا گیا۔ بہر حال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے۔ اور دونوں اس کی صواب دید کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔''

اور ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''و فی نفی الملک عن الکفّار فی صورة ''التقریر''، وجعلهم کالأکرّة العاملة للمسلمین، فوائد نیّرة، و منافع کثیرة لأهل الإسلام المستحقّین. إذا الأرض، و الخِراج بالمنع، والعطاء للمستحقّین. (16)

''اور اراضئ ہند کے بارے میں ''تقریر کی شکل میں'' یہ کہنا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کی ملکیت نہیں ہے اور ان کو کاشت کاروں اور اجارہ داروں کی

طرح قرار دینا جو مسلمانوں کے (بیت المال) کے لیے عامل کی حیثیت میں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے روشن فوائد اور کثیر منافع کا باعث ہے، اس لیے کہ زمین اور خراج کے دینے نہ دینے کا معاملہ دراصل مستحقین کے پیش نظر ہے۔"

اور دوسری جگہ "اراضئ ہند" کو مختلف انواع پر منقسم بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثمّ إعلم أنّ أراضى ولاية الهند ليست علٰى سننٍ واحدٍ، بل هى علٰى أنواعٍ شتّٰى." (17)

صرف ایک نوع میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے:

"منها ما أعطى الإمام بأوّل الفتح لبعض الغانمين، أو بعض المستحقّين." (18)

"من جملہ ایک صورت یہ ہے کہ امام نے جس وقت (ملک ہندوستان) کو فتح کیا تو اس فتح کی ابتدا ہی میں بعض زمینیں مجاہدین یا مستحقین کو عطا کر دیں۔"

اور آخر میں شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اس بحث کا یہ خلاصہ نکالتے ہیں:

"پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ہندوستان کی اکثر و بیش تر اراضی (زمینیں) ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہے، جو اس پر قابض ہیں۔ سوچو! اور سمجھو! پھر معلوم رہے کہ جب کہ ہندوستان کی اراضی ان انواعِ مختلفہ پر قائم ہے، جن کا گزشتہ ذکر ہو چکا ہے تو اراضئ ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدمِ ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے، جب تک یقین کے ساتھ حکم لگانے والے کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے۔ پس جس زمین کے بارے میں جس نوع سے متعلق ہونے کا یقین ہو جائے، اس کے مطابق حکم دینا چاہیے۔ لیکن اگر علمِ یقین حاصل نہ ہو تو فتویٰ دینے میں جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اس لیے کہ فصل قضایا کی بحث میں اس طرح فتویٰ دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔" (19)

شیخ جلال الدین نوّر اللہ مرقدہٗ کے یہ فقہی ارشادات یا فیصلے اس زمانے سے متعلق ہیں، جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا دور تھا۔ مغل اعظم کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے

ہاتھ میں ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کی مفتاح سعید (بہترین کنجی) تھی۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ کی رائے

اور ہندوستان کے مشہور محقق عالم مولانا محمد اعلیٰ تھانویؒ نے بھی اپنے رسالے میں ''اراضیٔ ہند'' کے متعلق یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرد یا جماعت کی شخصی ملکیت نہیں رہیں، بلکہ ارضِ مملکت اور ارضِ بیت المال ہیں۔ (چناں چہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:)

''اور مولانا محمد اعلیٰ تھانویؒ نے اپنے رسالے (احکام الاراضی) میں ذکر کیا ہے کہ اراضیٔ ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجیٔ، بلکہ اراضیٔ حوزہ ہیں۔ یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں، کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں''۔ (20)

(قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ نے شیخ جلال الدین تھانیسری قدس سرہٗ کے رسالہ ''تحقیق الاراضی'' کی تشریح میں ایک رسالہ ''احکام الاراضی'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ یہ رسالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری باب میں پوری بحث کو سمیٹتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''از آں چہ مذکور شد ثابت و واضح گشت کہ اراضی بلادِ ہند فئے و ملک بیت المال اند و مملوکۂ ذمیاں نیست اند باتفاقِ آئمہ اربعہ۔'' (21)

''جو کچھ پیچھے دلائل ذکر کیے گئے ہیں، ان سے ثابت اور واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شہروں کی اراضی بیت المال کی مِلک اور اس کے لیے فئے ہیں۔ انفرادی طور پر ذمّی لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں۔ اس پر آئمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔'')

حضرت امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی رائے

شیخ جلال الدینؒ اور محمد اعلیٰؒ کے چند صدی بعد جب برٹش حکومت کا تسلط ہوا تو علمائے اسلام کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ اراضیٔ ہند ''شخصی ملکیت'' میں ہیں یا نہیں؟ اور اُن پر عشر یا خراج واجب ہے یا نہیں؟ تو محقق عصر شاہ عبدالعزیز دہلوی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت بھی یہی فیصلہ دیا کہ اراضیٔ ہند بیت المال کی ملکیت ہیں، شخصی مملوکہ نہیں ہیں۔ اور یہاں زمین دار و تعلقہ دار مالک کی حیثیت میں نہیں۔ اس لیے

اراضئ ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی ہیں۔ (چناں چہ شاہ صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں "ملکیت" کی تشریح کرتے ہوئے تحریر) فرماتے ہیں:

"وحضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرّہ العزیز رسالہ در احکامِ اراضی ہند قلمی فرمودہ اند۔ دراں رسالہ ایں مذہب را بشواہد و دلائل بسیار ابطال فرمودہ۔ تحقیق فرمودہ اند: اراضئ ہند بدستور اراضئ سوادِ عراق، موقوف برمِلک عامۂ مسلم بے تخصیص است۔ یعنی درمِلک بیت المال است۔ وزمین داراں را بیش از قیّم بودند دخلے نیست۔ وقاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ نیز دریں باب رسالہ نوشتہ و ہمیں مسلک را ترجیح دادہ۔" (22)

"اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ "اراضئ ہند" کے احکام کے بارے میں لکھا۔ اور اس رسالے میں انھوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین، زمین داروں کی مِلک ہے) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لیے وقف ہیں۔ یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں۔ کسی شخص اور فرد کی ملکیت نہیں۔ اور نہ زمین داروں کی ملکیت اور نہ زمین داروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے۔ اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بارہ میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور انھوں نے اس میں شیخ جلال الدین ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔"

نیز ایک اور سوال کے جواب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"مگر بنا برآں چہ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرّہ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانندِ سوادِ عراق کہ در عہد حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح شدہ بود، موقوف بر مِلکِ بیت المال است۔ و زمیں داراں را بیش از تولیت و داروغگی تردّد و فراہم آوردن مزارعین و اعانت و زراعت وحفظ دخلے نیست۔ چناں چہ لفظِ "زمین دار" نیز اشعارے بآں مے کند، و تغیّر و تبدّل زمین داری، وعزل ونصب زمیں داران، و اِخراج بعضے از آں ہا، و

اقرار بعضے، و عطائے بعض اراضی بافغانان و بلوچان و سادات و قدوانیاں بصیغۂ زمیں داری دلالت صریحہ بریں مے کند پس دریں صورت جمیع اراضی ہندوستان مملوک بیت المال گشت ...الخ۔" (23)

"شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ نے اپنے رسالے میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ابتدائے فتح میں عراق کی طرح ہے (جو کہ حضرت فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) اور بیت المال کی مِلک پر ہی قائم ہے، اور زمین داروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور وفکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔ چناں چہ لفظ "زمین دار" بھی اسی کی خبر دیتا ہے۔ اور زمین داری میں تغیر و تبدل اور عزل و نصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لیے اثبات اور بعض کو داد و دہش، مثلاً افغانان، بلوچ، سادات، مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعویٰ کی صریح تائید کرتے ہیں"۔

جاگیرداری کے بارے میں مغل بادشاہوں کے سرکاری احکامات

علمائے اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضئ ہند پر جو تصرفات قائم رکھے، نیز شاہ عالم نے سرطامس رو کو دیوانی احکام سپُرد کرتے ہوئے زمین داروں کے متعلق جو معاہدہ کیا، اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا، وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضئ ہند کو "زمین دار" اور "تعلقہ دار" کی ذاتی و شخصی ملکیت نہیں سمجھتے۔ اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور "قیم" کی حیثیت دیتے تھے۔

پس جب کہ علمائے اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کی زمین حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے اور انہوں نے اس فیصلہ میں عامۂ مسلمین کی فلاح و بہبود کے پیش نظر مخصوص طبقۂ زمینداران و تعلقہ داران کے نقصان

کو قابلِ نظر انداز سمجھا اور اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ ''ارضِ عراق'' کو اسوۂ حسنہ قرار دیا تو آئندہ کے لیے ہندوستان کے معاشی نظام میں اس قسم کے اقدام کو غیر اسلامی کہنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ البتہ یہ دیکھنا از بس ضروری ہوگا کہ یہ اقدام عامۃ المسلمین کی معاشی فلاح کے لیے مفید ثابت ہو۔ **آمین**

إن أُرید إلّا الإصلاح ما استطعت وما توفیقی إلّا باللّٰہ .



حوالہ جات وحواشی

1۔ قرآنی جنگِ انقلاب، تفسیر سورۂ قتال، قرآنی شعورِ انقلاب۔ ص:172۔ طبع رحیمیہ مطبوعات، لاہور۔

2۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصل عبارت یہ ہے: ''وغالب سبب خراب البلدان فی ھٰذا الزمان شیئان: أحدھما تضییقھم علی بیت المال بأن یعتادوا التکسب بالأخذ منه علٰی أنھم من الغزاۃ ومن العلماء الذین لھم حق فیه أومن الذین جرت عادۃ الملوک بصلتھم کا لزُّھاد والشعراء .... الخ''. حجۃ اللّٰہ البالغۃ، مبحث الإرتفاقات، باب فنّ المعاملات. جلد1. صفحہ94. طبع بیروت.

3۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصل عبارت یہ ہے: ''صار جمھور الناس عیالاً علی الخلیفة یتکففون منه تارۃ علٰی أنھم من الغزاۃ والمدبِّرین للمدینه یترسمون برسومھم. ولا یکون المقصود دفع الحاجة ولکن القیام بسیرۃ سلفھم وتارۃ علٰی أنھم شعراء ....الخ''
حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد:1۔ صفحہ:222-221۔ طبع بیروت۔

4۔ اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، صفحہ 168۔

5۔ شاہ ولی اللہؒ کی اصل عبارت یہ ہے: فإنّھم إن کان أکثرھم مکتسبین بالصناعات وسیاسة البلدۃ والقلیل منھم مکتسبین بالرعی والزراعة فسدحالھم فی الدنیا. حجۃ اللّٰہ البالغه، ابواب إبتغاء الرزق. جلد2، صفحہ645-644. طبع: بیروت.

6۔ اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ 169۔

7۔ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب اِبتغاء الرزق۔ جلد:2۔ صفحہ:645۔ طبع: بیروت۔

8۔ مسند امام ابوحنیفہؒ مع ترجمہ مولانا سعد حسن خان۔ ص:312۔ مطبع: سعیدی قرآنی، کراچی۔

9۔ صحیح مسلم۔ جلد: 2۔ ص: 11-12۔ مطبوعہ: اصح المطابع، کراچی۔

10۔ موطا امام مالکؒ میں حدیث کی اصل عبارت یہ ہے:

عن ربیعة بن عبدالرّحمٰن، عن حنظلة بن قیس الزُّرَقی، عن رافع بن خدیج، أن رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: نهیٰ عن کراء المزارع. قال حنظلة: فسألتُ رافع بن خدیج: بالذّهب والورق؟ فقال: أمّا بالذّهب والورق فلا بأس به."

(مؤطا إمام مالک. کتاب المزارعة. حدیث نمبر: 2083ص: 249. طبع: بیروت)

11۔ تحفة الفقهاء۔ تالیف: علامہ سمرقندیؒ۔ جلد: 3۔ صفحہ: 442۔ طبع جامعہ دمشق۔

12۔ علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانیؒ کی اصل عبارت یہ ہے:

امّا شرعیة المزارعة فقد اختلف فیها، قال ابو حنیفةؒ إنها غیر مشرعة وبه أخذ الشافعیؒ ..... الخ." (البدائع و الصنائع. تالیف: علامه کاسانیؒ. کتاب المزارعة. جلد: 08. ص: 263. طبع: دار الکتب العلمیه، بیروت.

13۔ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے مرید متبحر عالم اور شیخ کامل تھے، دہلی کے قریب پنجاب کے علاقہ تھانیسر وطن مالوف تھا اور وہیں پچانوے سال زندہ رہ کر ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ (سیوہاروی)

14۔ یہ رسالہ مطبوعہ ہے مگر خود شیخ کے ہاتھ کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں بتایا جاتا ہے۔ (سیوہاروی)

15۔ تحقیق اراضی ہند۔ تالیف: شیخ جلال الدین تھانیسریؒ۔ ص: 3۔

16۔ ایضاً۔ ص: 7۔

17۔ ایضاً۔ ص: 11۔

18۔ ایضاً۔

19۔ ایضاً۔ ص: 12-13۔

20۔ العرف الشذی۔ زیر درس رأس المحدثین حضرت الشیخ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ۔ ص: 286۔ مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی۔ (سیوہاروی)

21۔ احکام الاراضی (قلمی)۔ تالیف: قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ۔ ص: 97۔ عکس قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی عبدالسلام کولیکشن، علی گڑھ۔

22۔ فتاویٰ عزیزی (فارسی)۔ از حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ۔ جلد: 02۔ ص: 27۔ طبع: مجتبائی، دہلی۔

23۔ فتاویٰ عزیزی (فارسی)۔ از حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ۔ جلد: 01۔ ص: 43۔ طبع: مجتبائی، دہلی۔

☆☆☆☆

فصل چہارم

انسانی معاشرہ اور اس کا سماجی ارتقا

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعیت پر بحث کے ساتھ ساتھ کچھ انسانی اجتماع اور معاشرے کے ارتقا پر بھی شاہ صاحبؒ کی رائے معلوم کی جائے۔ تاکہ یہ بحث ادھوری نہ رہ جائے۔

انسانی اجتماع کے طبعی اور نوعی تقاضے

شاہ صاحبؒ انسانی اجتماع کی اساس خود انسان کو مانتے ہیں۔ یہ صلاحیت اس کا فطری اور نوعی تقاضا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

جہاں تک اس کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے، مثلاً کھانا، پینا، جنسی میلان، شدید سردی اور گرمی سے بچنا وغیرہ، ان سب ضروریات میں انسان دوسرے حیوانات کے ساتھ شریک ہے۔ قدرت کی طرف سے ہر حیوان میں طبعی الہام کے ذریعے یہ سمجھ ودیعت رکھی گئی ہے کہ وہ ان ضروریاتِ زندگی کو مادی اشیا سے کس طرح حاصل کرے۔ اس طبعی خواہش میں انسانیت کے جملہ افراد اور اشخاص مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ناقص الخلقت لوگوں کو چھوڑ کر جن میں انسانی صورتِ نوعیہ کا ظہور پورے طور پر نہیں ہوا۔

یہ طبعی الہام صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ دوسرے حیوانات کو بھی ہوتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی کو الہام ہوا ہے کہ وہ کس طرح اجتماعی زندگی بسر کرے۔ مثلاً خاص پھلوں اور پھول پتیوں کا انتخاب اور رہائش کے لیے کس طرح چھتہ بنائے۔ چھتے میں رہنے کا خاص اجتماعی طریقہ، خاص امیر یعسوب کی رہنمائی میں کام کرنا اور شہد جمع کرنا وغیرہ۔ شہد کی مکھی کو یہ سب تعلیم اس کی فطرت سے ملتی ہے۔ اسی طرح پرندوں کو بھی ان کے نوعی تقاضے کے موافق یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ

کس طرح دانہ و پانی کی تلاش کریں۔ بلی اور شکاری سے کس طرح بھاگ جائیں۔ اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی طلب میں اگر کوئی مزاحم ہو تو کس طرح اس سے بچیں۔ نر اور مادے کا ایک مخصوص طریقے پر انڈوں کو سینا۔ اور بچوں کو چوگا دینا۔ یہ سب باتیں ان کو ان کی فطرت نے سکھائی ہیں۔ اس طرح ہر نوع کے طبعی تقاضے ہوتے ہیں جو ان کی طبیعتِ نوعیہ کی طرف سے ان کے افراد کو ودیعت کیے گئے ہیں۔" (1)

انسانی زندگی میں "ارتفاقات" کی اہمیت

اسی طرح انسان کو بھی فطرت کی طرف سے اس قسم کی تعلیم دی گئی ہے کہ مادی چیزوں سے کس طرح نفع حاصل کرے۔ اور ان کو اپنی ضرورت کے لیے کام میں لائے۔ اسی کو فلسفۂ ولی اللّٰہی میں "ارتفاق" کہا جاتا ہے۔

انسان کی صورتِ نوعیہ، کہ جب دوسرے حیواناتِ نوعیہ کی صورِ نوعیہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ انسان کو نفسِ ناطقہ (علم کی استعداد رکھنے والا نفس) عطا ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی انسان زمین پر عادلانہ نظام قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اسے علم کی روشنی سے منور بھی کرسکتا ہے۔

انسان کی تین بنیادی خصوصیات

اس لحاظ سے اسے تین مخصوص (نوعی) تقاضے بھی عطا ہوئے ہیں۔ جو دوسرے حیوانات میں نہیں پائے جاتے۔ (2)

1۔ رائے کلی یعنی مفادِ عامہ کی اہمیت

انسان کو ظاہری اور باطنی حواس کے علاوہ ذہن جیسی قوت بھی عطا ہوئی ہے۔ جس کے ذریعے وہ رائے کلی اور فکر و نظر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ محسوس چیزوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ اور نظر و فکر سے نامعلوم اشیا کو معلوم کرسکتا ہے۔ غرض یہ کہ انسان کی یہ خاصیت ہے کہ کسی شئے کی طرف اس کا میلان رائے کلی سے بھی ہوتا ہے۔ اور حیوانات میں صرف ان کی طبیعت سے کسی محسوس یا موہوم غرض مثلاً بھوک، پیاس اور جنسی میلان کی طرف

شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان کسی ایسے معقول نفع کو سامنے رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، جس کے لیے اس کی طبیعت خاموش ہوتی ہے۔ مثلاً اجتماع میں صالح نظام رائج کرنا یا تہذیب نفس اور تکمیل اَخلاق کے لیے کوشاں رہنا یا آخرت کے عذاب سے نجات پانے کی فکر وغیرہ۔

2۔ حبِ جمال کے تقاضے

انسان کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ مادی چیزوں سے نفع حاصل کرنے میں لطافت اور ذوقِ جمال سے کام لیتا ہے۔ مثلاً بہائم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ایسی چیز مل جائے جس سے ان کی ضرورت پوری ہو۔ اور انسان صرف حاجت روائی کا خیال نہیں رکھتا، بلکہ حسن و تحسین اور مذاقِ لطیف کا بھی طالب رہتا ہے۔ مثلاً وہ ایک حسین عورت، لذیذ طعام، عمدہ لباس اور اچھے مکان کو پسند کرتا ہے۔

3۔ عقلی بنیادوں پر ایجاد و تقلید کی صلاحیت

تیسری خاصیت یہ ہے کہ انسانوں کے اندر ذی عقل اور ذی فہم افراد پائے جاتے ہیں۔ جو نوعِ انسانی کے لیے مادی وسائل ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات حیوانات اور بہائم میں نہیں پائی جاتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان دوسری مخلوقات کے برخلاف ایسے اُمور کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ جو اسے نہ تو ظاہری حواسِ خمسہ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ اور نہ وہ چیزیں وہم و خیال کے مدرکات سے ہوتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو صرف انسان کی عقل پسند کرتی ہے۔ جیسے اَخلاق کو سنوارنا، نفسی کیفیات پر قابو پانا اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنا۔ یہ سب باتیں انسانی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ باتیں انسانیت کی تاریخ میں اقوامِ عالم کے اندر پائی نہ جاتیں۔ کسی نوع کے افراد اگر نوعی تقاضاؤں پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو ان کے مزاج میں خلل آجائے گا۔ کیوں کہ نوعی تقاضاؤں پر عمل پیرا ہونے سے ان کا مزاج سالم رہتا ہے۔

انسانی معاشرے کا سماجی ارتقا

شاہ صاحبؒ مخلوقات کے ارتقائی مدارج کی مثال سے اجتماعی اداروں کے مختلف درجات کا باہمی ربط و تعلق بھی سمجھاتے ہیں۔ جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں ارتقا کو اسی طرح کارفرما مانتے ہیں، جس طرح کائنات کے دوسرے مظاہر ہیں۔

چناں چہ "البدور البازغہ" میں فرماتے ہیں:

"انسانی معاشرے کے ابتدائی درجے میں اجتماعی اداروں کی تشکیل جانوروں کے اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ فرق اتنا ہے کہ حیوانات میں یہ ارتفاق بطورِ اجمال پایا جاتا تھا۔ انسانوں میں آ کر یہ پوری طرح نشوونما پایا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی حیوانات کے اجتماع کی نسبت زیادہ بہتر اور بلند مرتبہ ہوتا ہے۔ حیوانی معاشرے کے بعد انسانی معاشرے کا یہ ابتدائی درجہ بالکل اسی طرح وجود میں آتا ہے، جس طرح کائنات کے عناصر سے جمادات پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں معاشرے کا دوسرا درجہ پہلے درجہ کے بعد آتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھنی چاہیے جیسے جمادات کے بعد نباتات کا آنا۔ انسانی معاشرے کے اس درجے میں پہلے درجے کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اب ان میں لطافت، عمدگی اور بہتر تنظیم پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرے درجے کے بعد انسانی معاشرے کے تیسرے درجے کا آنا نباتات کے بعد حیوانات کی تخلیق کی مانند ہے۔ جس طرح حیوانات میں نباتات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس تیسرے درجے میں دوسرے درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ذرا مختلف شکل میں۔ حیوانات کے بعد انسانیت کی منزل آتی ہے۔ ارتفاقات (اجتماعی اداروں) میں جس کی مثال تیسرے اور چوتھے درجے کو سمجھنا چاہیے۔(3)

معاشرے کے ارتقا کی چار منزلیں

''بدورِ بازغہ'' کی مذکورہ تحقیق کی بنا پر شاہ صاحبؒ کے ہاں انسانی معاشرے یا اجتماع کو اپنے ارتقا میں چار منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور شاہ صاحبؒ کے فلسفے میں ان کو ''ارتفاقات'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

معاشرے کی پہلی منزل؛ ارتفاقِ اوّل

ان میں سے انسانی اجتماع کی پہلی منزل وہ بنیادی منزل ہے، جس سے انسانی معاشرے کا کوئی فرد بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

انسان کی مذکورہ خصوصی صفات سب افراد میں ایک جیسی نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے شاہ صاحب نے ''ارتفاقات'' کی دو حدیں قائم کی ہیں۔ ایک وہ ہے جس سے انسانوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاشرہ بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ چاہے وہ انسانی اجتماع پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی کیوں نہ رہتا ہو۔ یا مہذب ممالک سے دور دراز اطراف میں رہتا ہو۔ شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی اصطلاح میں اس کا نام ''ارتفاق اوّل'' ہے۔

اس مرتبے کی ایک بنیادی چیز زبان ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھاتا ہے۔ اور اپنے خیالات سے دوسروں کو زبان کی وساطت سے مطلع کرتا ہے۔ اگر کسی معاشرے یا اجتماع میں اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھانے کے لیے کوئی زبان نہ ہو تو ایسا معاشرہ کسی بھی کام کو اجتماعی طور پر سرانجام نہیں دے سکتا۔ شاہ صاحبؒ نے اس منزل میں جس زبان کو ضروری قرار دیا ہے، وہ اس کی ابتدائی شکل ہے۔ مثلاً جن چیزوں کا بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ یا وہ باتیں جن سے انسان میں بعض وجدانات اور احساسات کی تحریک ہوتی ہے۔ اور پھر انسان کوشش کرتا ہے کہ کسی مناسب آواز اور الفاظ کے ذریعے اپنے اس وجدان یا احساس کا اظہار کرے۔ اور دوسرے کو سمجھائے۔ اس قسم کے الفاظ اور عبارات کو کسی زبان کا ابتدائی مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس زبان میں روز بروز وسعت ہوتی رہتی ہے۔

معاشرے کے اس پہلے مرتبے کی دوسری چیزیں یہ ہیں: کھیتی باڑی، کنویں کھودنا، کھانے پکانے کی کیفیت معلوم کرنا، برتن وغیرہ بنانا، چوپایوں کی پرورش کرنا اور ان کو

سواری کے کام میں لانا اور ان کے گوشت پوست، بال، پشم، دودھ اور نسل سے نفع حاصل کرنا وغیرہ۔ پوشاک اور جائے رہائش بھی اس پہلے مرتبے کی ضروریات میں داخل ہیں۔ اس منزل میں انسان کے لیے ایک رفیقۂ حیات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں کوئی دوسرا انسان مزاحمت نہ کر سکے۔ اس سے وہ جنسی جذبات کی تسکین کے ساتھ بقائے نسل اور گھریلو کاروبار میں مددگار کا کام بھی لیتا ہے۔ (4)

انسانی معاشرے کی پہلی منزل کی پابندی تمام اقوام اور قبائل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کی پابندی کیے بغیر ان کا اجتماعی زندگی بسر کرنا دُشوار، بلکہ ناممکن ہے۔

معاشرے کی دوسری منزل؛ ارتفاقِ ثانی

انسانی اجتماع، معاشرتی ارتقا میں پہلی منزل عبور کر کے مزید ترقی کا راستہ ہموار کرتا ہوا جب آگے بڑھتا ہے تو انسانی اجتماع کی یہ دوسری منزل کہلاتی ہے۔ اور فلسفۂ ولی اللّٰہی میں اس کا نام ''ارتفاقِ دوم'' ہے۔

اس میں انسان پہلی منزل کی سادہ شکل پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے اچھے ذرائع کی تلاش رکھتا ہے۔ اور اس عرصے میں اس کے مشاہدۂ تجرباتی اور فطری علوم میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور آگے چل کر معاشرے کے اجتماع کی دوسری منزل وجود میں آتی ہے۔

ارتفاقِ دوم یا معاشرے کو ترقی کے راستے پر لے جانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے؟ اس کی وضاحت کے لیے شاہ صاحب نے اپنی مشہورِ عالم تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں تین ابواب رکھے ہیں:

1۔ فن آداب معاش۔
2۔ تدبیر منزل۔
3۔ اقتصادیات یا فنِ معاملات۔

1۔ فن آدابِ معاش

فن آدابِ معاش میں زندگی کے ایسے اصول اور موزوں طریقے بتائے جاتے ہیں، جن کی روشنی میں معاشرے کی پہلی منزل کی ضروریاتِ زندگی کو صحیح تجربات اور مشاہدہ کی

کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔اور پھر ان میں سے وہ باتیں اختیار کی جاتی ہیں، جن کا نفع بہت زیادہ اور نقصان بہت کم ہو۔ اور یہ طور طریقے رائے کلی اور مذاقِ لطیف (ذوقِ جمال) کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً کھانے پینے، رہنے سہنے، اوڑھنے پہننے اور طرزِ زندگی کے موزوں طریقے اختیار کرنا اور شائستگی کا خیال رکھنا۔ یہ سب باتیں رفاہیت اور خوشحالی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں رفاہیتِ بالغہ (بے حد آرام طلبی) اور باہمی نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

2۔ تدبیرِ منزل

تدبیرِ منزل حکمت کا ایک فن ہے۔ جس میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ گھر والوں کے باہمی ربط و ضبط اور تعلقات میں ارتفاق کی ترقی یافتہ شکل کی حفاظت کی کیا صورت ہونی چاہیے۔اس میں حُسنِ تدبیر اور رائے کلی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ (5)

تدبیرِ منزل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو بقائے نوع کے لیے توالد و تناسل کی ضرورت تھی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی دونوں حسنِ معاشرت اور خوش اسلوبی سے زندگی بسر کریں۔ جب ان کو اولاد پیدا ہوتی ہے تو فطری طور پر ان کے دلوں میں اولاد پر شفقت کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور دونوں مل کر اولاد کی تربیت کرتے ہیں۔ مرد اور عورت کی طبیعتیں فطری طور پر کچھ مختلف خاصیتیں رکھتی ہیں۔عورت کے اندر امورِ خانہ داری کو بہترین صورت پر سرانجام دینے کی قابلیت موجود ہے۔ مرد نسبتاً زیادہ محنت اور مشقت کے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ ان دونوں کا اپنے فطری تقاضوں کے موافق گھر کا کاروبار چلانا اَحسن معیشت کی بنیاد ہے۔اور اس تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ گھر کے افراد میں مساوات کے احساس کے ساتھ باہمی فرقِ مراتب کا احترام بھی صحیح طور پر موجود رہے۔

شاہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فن تدبیر پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔تفصیل کے لیے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

3۔ اقتصادیات یا فن معاملات

اجتماع کے دوسرے مرتبے کی یہ خاصیت تھی کہ ضروریاتِ زندگی کو اچھی صورت میں

پیش کیا جائے۔ اور ان کے حاصل ہونے کے بعد معاشرہ خوش حال کہلائے۔ اس صورت میں معاشرے کے ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرنے میں خوبصورتی اور مذاقِ لطیف کا خیال رکھا جائے۔ جب نوعِ انسانی کے افراد کی ضروریاتِ زندگی بڑھ گئیں اور ان میں نفاست اور پاکیزگی کا خیال بھی ملحوظ ہوا، تو اس صورت میں یہ ناممکن تھا کہ ایک فرد اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود تیار کرے۔ اس لیے مختلف افراد ضرورتِ انسانی کی اشیا کی تیاری میں لگ گئے۔ اور ایسے ہی مختلف پیشے وجود میں آئے۔ اور پھر ان کے لیے یہ ضروری ہوا کہ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین اور معاملہ کر کے اجتماعی زندگی بسر کریں۔

پیشوں کے اس تنوّع سے یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ ہر شخص انسانی ضرورت کی ایک چیز تیار کرنے لگا۔ حال آں کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے اور بہت سی اشیا کی ضرورت ہے۔ اس لیے معاشرے کے سب افراد کے لیے جملہ ضروریاتِ زندگی سے فائدہ اٹھانے کی سہل صورت یہ تھی کہ مبادلۂ اَجناس کے طریقے کو رائج کیا جائے۔ مثلاً ایک کسان دوسرے کسی پیشہ ور کو غلہ دے کر تبادلے میں اپنی ضرورت کی چیز حاصل کرے۔

ایک مدت تک لوگوں نے آپس میں تبادلہ کی یہ صورت اختیار کی۔ مگر اس میں ایک طرف طرفین کو تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی تو دوسری طرف یہ صورت بھی پیدا ہوگئی کہ مثلاً ایک شخص کے پاس اَناج ہے۔ اور اس کو روئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسرے کے پاس روئی تو ہے، لیکن سرِ دست اس کو غلے کی ضرورت نہ تھی۔ غلہ اس کے پاس موجود تھا۔ جب یہ دُشواری پیش آئی تو اس دُشواری کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ معدنی اشیا (سونے اور چاندی) کو مبادلے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس لیے کہ سونا اور چاندی اس غرض کے لیے نہایت موزوں تھے۔ کیوں کہ ان کی ضخامت کم تھی اور ان کے لانے اور لے جانے میں آسانی رہتی تھی۔ اور ان کے اجزا میں مماثلت اور یکسانی پائی جاتی تھی۔ گویا سونے اور چاندی کی تخلیق ہی اس غرض کے لیے ہوئی ہے کہ ان کو نقدی کے طور پر استعمال کیا جائے۔ دوسری کسی چیز میں سب اَوصاف ایک جگہ نہیں پائے جاتے۔

معاشرے کے اس دوسرے درجے میں قدیم دور کے اندر اگرچہ اصلی پیشے محدود تھے،

مگر انسانی ضروریات بڑھتی رہیں تو کسب اور پیشے کے مفہوم میں بھی وسعت آتی گئی۔ اور انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے بھی بدل گئے۔ اب ہر ایسی جدوجہد کو پیشہ کہنے لگے، جس سے معاشرے کی تکمیل ہوتی۔ اور اجتماعی زندگی بسر کرنے میں سہولت پیدا ہوتی ہو۔ اس لیے معاشرئے کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ دوسرے افراد سے زندگی کی دوڑ میں الگ تھلگ نہ رہے۔ بلکہ اپنی اور دوسرے انسانوں کی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کی جدوجہد میں برابر کا شریک رہے۔ اس کے لیے مضبوط قسم کی تنظیم کی ضرورت پیش آئی۔ جس سے معاشرے کا تیسرا مرتبہ وجود میں آ گیا۔ (6)

معاشرے کی تیسری منزل؛ ارتفاقِ سوم

معاشرے کی یہ تیسری منزل دوسری منزل کا فطری نتیجہ ہے۔ جس میں معاشرہ ایک وسیع اور متحد نظام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور اسی سے مملکت کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہر شخص کا پیشہ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتا ہے۔ اور انہیں باہمی امداد کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے تو اس وقت ایک مضبوط سیاسی نظام کی بہت زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اس قسم کے مضبوط نظام اور مملکت کو شاہ صاحبؒ ''ارتفاقِ سوم'' یا معاشرے کی تیسری منزل قرار دیتے ہیں۔ اس مملکت کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے اپنی مشہور تالیف ''البدور البازغہ'' میں جو وضاحت فرمائی ہے اسے یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''بے شک جب انسان باہمی معاملہ کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں متاعِ تجارت کے مبادلے کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگوں کے درمیان مثلاً کاشت کاروں، تاجروں اور کپڑا بُننے والوں وغیرہ کا باہمی رشتہ اور اتحاد پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے باہمی تعاون سے نظامِ مملکت وجود میں آتا ہے۔ حقیقی مملکت چاردیواری، قلعہ اور تجارتی مرکز کا نام نہیں۔ اگر بہت سے شہر ایک دوسرے کے قرب و جوار میں ہیں اور ان کے باشندوں کا باہمی معاملہ اور لین دین جاری ہے تو یہ بھی ایک مملکت کہلائے گی۔'' (7)

معاشرے کی چوتھی منزل؛ ارتفاقِ چہارم

شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ منزل سیاستِ مدنیہ کی ایک شاخ ہے۔ اور معاشرے کے ارتقا کے دوران جو بین الاقوامی حکومت وجود میں آتی ہے، وہ معاشرے کی چوتھی منزل ہے۔ یہ ایک ایسی وحدت ہے، جو مختلف اکائیوں کی ترکیب سے ایک اکائی بن جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہر ایک ملک میں الگ حکومت ہو اور ہر ایک کے ذرائع آمدنی، اس کا خزانہ اور اس کی محافظ فوج علاحدہ ہو تو ان کے مختلف اَمزِجہ (مزاجوں) اور ان کی الگ الگ استعداد اس کی باعث بنتی ہے کہ ان میں ظلم رواج پکڑے۔ اور سنتِ راشدہ کو چھوڑ دیں۔ اور ہر ایک مملکت جذبۂ طمع سے تحریک پا کر دوسری مملکت پر غلبے کی خواہاں ہو۔ مختلف مملکتوں کی یہ نوعیت ایک عظیم طاقت ور نظام اور بین الاقوامی مملکت کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ جس میں یہ صلاحیت ہو کہ دوسری تمام مملکتوں کو پُر امن رہنے کے لیے قابو میں رکھے۔ یہ ضرورت ایک اعلیٰ خلافت کی شکل یا ایک بین الاقوامی حکومت سے پوری ہو جاتی ہے۔

ارتفاق چہارم یا معاشرے کی چوتھی منزل کے متعلق شاہ صاحبؒ کی مذکورہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک امیر کی اطاعت مرکزیت کے لیے ضروری ہے۔ عصرِ حاضر کے نوجوان اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ اس سلسلے میں علامہ عبیداللہ سندھیؒ کی طرف سے اس مسئلے کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ حضرت علامہ استاد فرماتے ہیں:

> ''آج کل کے سیاسی نظاموں میں اہلِ علم صرف ایک امیر کی اطاعت کو مرکزیت کے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اس سے خرابیاں پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ شاہ صاحبؒ اس کا علاج تجویز کرتے ہیں کہ ایک بورڈ ہو۔ جس کے ارکان کے ہاتھ میں الگ الگ اختیارات ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، میں نے کسی مذہبی عالم کے ہاں اس طرح کا فکر نہیں پایا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک کامل ریاست میں، جس میں بہت سے افراد ہوتے ہیں، نظام قائم رکھنے کے لیے ایک ایسا آدمی ہونا چاہیے۔ جو اکیلا سب امور کی کفالت کرے۔ اور وہ ''الإمام الحقّ'' ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ارشاد ہوتا

ہے "**وقلما یوجد ذلک**" اور ایسا آدمی کم ملتا ہے۔ چناں چہ اکثر دو تین امور ایک آدمی کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ اور باقی امور دوسرے کے پاس۔ شخصی حکومت کے بجائے عُقلائے قوم کی یہ تجویز پارلیمنٹری نظام کا نقطۂ آغاز ہوسکتی تھی۔ کاش! اس وقت اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

"اقترابات"، جن سے مراد قربِ الٰہی کے حصول کے ذرائع اور "ارتفاقات" جو عبارت ہیں، معاشی، سیاسی و اجتماعی تدابیر سے، شاہ صاحبؒ کے نزدیک ان دونوں کے لیے اسلام "صراطِ مستقیم" پیش کرتا ہے۔ اس نے قیصریت وکسرویت کو ختم کر کے "ارتفاقات" میں راہِ وسط پیدا کی۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ انھوں نے یہ بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کرنا بھی تھا۔"(8)

کیفیتِ نظامِ اجتماع

شاہ صاحبؒ کی نظر میں فرد کی طرح انسانی اجتماع کا نظام بھی تین طرح کا ہوتا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ "البدور البازغہ" میں فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ انسانی اجتماع کے نظام میں تین حالتیں ہوتی ہیں:

1۔ کامل صحت 2۔ ناقص صحت 3۔ مرضِ مہلک

انسانی صحت کا اصل مقتضا تو یہ ہے کہ وہ اچھی صحت پر رہے۔ اور جب اس میں خلل واقع ہوتا ہے تو (انسانی اجتماع کی) صحت بگڑ جاتی ہے۔ اس حالت میں یا تو صحت ناقص رہتی ہے یا اسے مہلک مرض لاحق ہوجاتا ہے۔ جو بالآخر (معاشرے کو) ہلاک کردیتا ہے۔ (اس کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ) ارتفاق کی پہلی منزل سے کوئی بھی انسانی فرد خالی نہیں ہوسکتا۔ چاہے وہ پہاڑوں پر رہتا ہو یا صحراؤں میں بودوباش رکھتا ہو۔ اسی طرح ارتفاق کی دوسری منزل سے انسانیت کی اکثریت بچ نہیں سکتی۔ خاص طور پر بڑے شہروں کے رہنے والے اور مہذب لوگ تو اس کو ضرور اپناتے ہیں۔ اگر کسی جگہ یہ دوسرا ارتفاق دیکھنے میں نہ آئے تو اس کا اصلی سبب ان لوگوں کے مزاج کی خرابی ہوگا۔ تیسرے ارتفاق کو بھی

اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا رہتا ہے۔'' (9)

اس مختصر تمہید کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ انسانی معاشرے کی صحت کا مدار مال اور دولت کی عادلانہ تقسیم پر ہے۔ تیسرے ارتفاق میں جب ایک حکومت وجود میں آتی ہے تو اس کا بھی اوّلین فریضہ دولت کی عادلانہ تقسیم ہے۔

انبیا علیہم السلام نہ صرف انسانوں کی اُخروی فلاح کے لیے بلکہ ان کی دعوت کا ایک اہم پہلو انسانیت کی دنیوی بہبود وفلاح بھی تھا۔ یہی سبب ہے کہ یوسف علیہ السلام کی جب مصر کے بادشاہ کے سامنے عصمت اور امانت کھل کر ثابت ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر وزیر خزانہ کا عہدہ طلب فرمایا:

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ۝ (55:12)

یعنی ''مجھے زمین کے خزائن کا محافظ بنا دو۔ کیوں کہ میں مال و دولت کی حفاظت اور اس کی عادلانہ تقسیم سے باخبر ہوں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت یوسف علیہ السلام تک اس خاندان کی ثروت اور خوش حالی کا مدار مویشیوں کے ریوڑ پر تھا۔ اور اس میں ہر قسم کی تعلیم موجود ہے۔ مثلاً ریوڑ کی بہتری کا خیال رکھنا۔ اور ایسی تدابیر اختیار کرنا، جن سے اس کی پیدائش میں اضافہ ہو۔ دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت اور نشوونما ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس بنا پر شعبۂ مالیات کی ترقی کے وسائل کو خوب سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے بادشاہ سے کہا کہ میں (معاشی معاملے) میں اچھی خبر رکھتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ کی رائے میں تو جتنے بھی انبیا علیہم السلام تشریف لائے تھے، ان سب کی نبوت تدبیر الٰہی کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ انسانی اجتماع اور معاشرے کو مصائب سے بچانے کے لیے جو طے شدہ تدبیر الٰہی ہے، نبوت اس کا ایک جزو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تدبیر الٰہی اسے اختیار کرتی تھی۔ اور انبیاؑ مبعوث ہوتے تھے۔ اس ضرورت کو خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم جیسی کامل اور وحی کے ذریعہ مُنَزَّل کتاب اور شریعتِ حقّہ کے قیام سے ختم کر دیا۔

انسانی اجتماع کی فکری وحدت اور اقتصادی اشتراک

شاہ صاحبؒ کی اصطلاح ''اقتراب'' اور ''ارتفاق'' سے اصلی مقصد اور مراد انسانی اجتماع کی فکری وحدت اور اقتصادی اشتراک ہے۔

فکری وحدت کی اہمیت

قرآن شریف کی سورۂ انعام میں فکری وحدت کی خلاف ورزی کی مذمت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ (159:6)

یعنی ''جن لوگوں نے فرقے بنالیے ہیں، تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (کیوں کہ وہ وحدتِ فکری کو خراب اور برباد کررہے ہیں)۔''

اس آیت کے مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۂ روم میں:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ﴿۳۱﴾ (31:30)

''نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو۔''

کے الفاظ پر غور فرمایئے! یعنی ''اللہ سے تعلق پیدا کرو۔'' اور نماز اس تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور یہی ''اقتراب'' ہے یعنی ایسی جماعت پیدا کرو جس کا اللہ سے تعلق ہو۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ﴿۳۱﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا اپنے سردار بنا کر ان کو مت پوجو، یعنی ان سرداروں کے اَحکام اور اشاروں پر چل کر فطرتِ الٰہی کو مت بگاڑو! یہ سردار تم کو آپس میں لڑا کر فرقہ بازی کا مرض پیدا کریں گے۔

اس لحاظ سے ''مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ﴿۳۱﴾'' سے مراد اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا (32:30) (بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا، اور وہ گروہ در گروہ بن گئے) ہوگا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے اپنے سرداروں کی طرف داری کرتے ہیں اور اس تفرقہ کی یہ صورت ہوگی کہ کچھ لوگوں نے ایک آدمی کی پیروی قبول کر کے اس کو اپنے لیے معبود کا درجہ دے دیا۔ اور اس کے تابع ہو کر ایک فرقہ بنالیا۔ اور دوسرے لوگوں نے کسی دوسرے انسان کو اپنا سردار بنالیا۔ فرقہ پرستی اسی طرح بڑھتی رہی۔ اور یہ فطرت کے خلاف

ہے۔ ہر سردار اپنی جماعت کو بڑھا کر اس کو دوسری جماعت سے لڑا دیتا ہے۔ انسانی معاشرے کی فلاح باہمی کشت وخون کی اجازت نہیں دیتی۔ جب انسانی اجتماع یا ہیئتِ اجتماعیہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے تو باہمی جنگ وقتال ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر سوسائٹی کو فطرت کے مطابق رکھنا منظور ہے تو اس کا دینی سردار ایک ہونا چاہیے۔ اور یہ ایک ہے۔ اس سے بات صاف صاف سمجھ میں آتی ہے کہ شرک انسانی اجتماع کی فطرت کے خلاف ہے جو اسے دو حصوں میں بانٹ کر لڑا دیتا ہے۔

اقتصادی اشتراک اور مالی تعاون کی اہمیت

انسانی اجتماع کے لیے فکری وحدت کے بعد اقتصادی اشتراک اور مالی تعاون ضروری چیز ہے۔ اس سے انسانی معاشرہ مضبوط ہوتا ہے۔ جب تک کسی معاشرے میں اس کی تکمیل نہ ہوگی اور تقسیم مال و دولت کا نظام عادلانہ اور مساویانہ نہ ہوگا تو یہ بحرانی حالت سے دوچار ہوگا۔ اور اس سے صحیح امور کا صدور نہ ہوگا۔ اور نہ وہ ٹھیک طور پر ترقی کر سکے گا۔

اقتصادی اشتراک رکھنے کے لیے جماعت کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو اس طرح تقسیم کرے کہ اس سے اول اپنے رشتہ داروں کی ضرورت و احتیاج کو پورا کرے اور ان کو حصہ دے۔ چناں چہ سورۃ الروم میں ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط (38:30)

''رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کے حقوق ادا کرو۔''

اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد قرآنِ مجید میں ''وَالْمِسْكِيْنَ'' کہہ کر یہ حکم صادر ہوا کہ رشتے داروں کے ساتھ مساکین کو بھی اپنے مال میں شریک بناؤ۔ پھر ''وَابْنَ السَّبِيْلِ ط'' مسافر کا ذکر ہوا۔ اسے بھی اس کا حق دو۔ اور اس کو اپنے مال میں شریک بناؤ! ایک خاندان کو دوسرے خاندان سے اور ایک قوم کو دوسری قوم سے ملانے کے لیے مسافروں کی ضرورت رہتی ہے۔ سیاحت پیشہ لوگ ہمیشہ قوموں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور ایک سوسائٹی کے حالات سے دوسری سوسائٹی کو باخبر کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ سوسائٹی کا ایک مفید حصہ ہیں۔ سوسائٹی کا ہر فرد جب مسافروں کو اپنی زندگی کی ضرورتوں میں شریک کرتا ہے تو انسانی اجتماع اور سوسائٹی میں ایک قسم کا اشتراک پیدا ہوتا

ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے، جس سے انسانوں میں بتدریج محبت اور اقتصادی اشتراک اور تعاون پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اور اس طرح انسانی دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا۔

اسلام کے اقتصادی نظام کے فوائد

اسلام نے ایک ایسا اقتصادی نظام پیدا کیا ہے کہ جب اس پر عمل ہوتا تھا تو ایک مسلمان ہسپانیہ سے لے کر چین تک ایک پیسہ لیے بغیر سفر کر سکتا تھا۔ نوجوان مسلمانوں کو اپنی طبیعت کے موافق جس فن کا شوق پیدا ہوتا تھا، اس کی تکمیل کے لیے بغیر پیسہ سفر کرتے۔ اور دنیا بھر کی اسلامی سوسائٹی کے ذریعے اپنے فن کی تکمیل کرتے تھے۔ اس طرح نہ تو کسی آدمی پر بوجھ پڑتا تھا۔ اور نہ مسلمان مسافر مالی امداد لینے میں اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ یورپ اپنی ترقی کے دور میں بھی یہ روح پیدا نہ کر سکا۔

افسوس ہے کہ یہ اقتصادی اشتراک اور تعاون آہستہ آہستہ مسلمانوں سے اٹھتا گیا۔ جس کے نتیجے میں مسلمان اپنی ثقافتی وراثت چھوڑ کر تنزل اور غلامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ دنیا کی اکثر آبادی کے نوجوان اشتراکیت کی طرف مائل ہیں۔ مگر ان کا لائحہ عمل دینی سعادت سے بے بہرہ ہے۔ اسی وقفے میں اگر مسلمان نوجوانوں نے اپنے اقتصادی اشتراک کے ورثے کو دوبارہ ہاتھ میں لانے کی تھوڑی سی کوشش شروع کر دی تو پھر ان کو کوئی غلام نہیں بنا سکتا۔ مسلمانوں کی کسی جماعت یا قوم میں اگر یہ کام شروع ہو گیا تو امید ہے کہ مسلمانوں کی دوسری قومیں بھی اس میں بہت جلد شریک ہو جائیں گی۔ اور ایک ایسا زبردست بین الاقوامی اسلامی مرکز بن جائے گا جس کا مقابلہ کوئی طاقت نہ کر سکے گی۔



حوالہ جات وحواشی

1. إعلم أن الإنسان يوافق أبناء جنسه فى الحاجة إلى الأكل والشرب والجماع الإستظلال من الشمس والمطر...الخ. حجة اللّٰه البالغه، المبحث الثالث، مبحث الإرتفاقات، باب كيفية إستنباط الإرتفاقات. صفحه: 80. طبع: بيروت.
2. حیوانیت سے انسانیت کے ممتاز ہونے کی تین خصوصیات کے بارے میں تفصیل دیکھئے: حجة اللّٰه البالغه. المبحث الثالث: مبحث الإرتفاقات. باب كيفية إستنباط الإرتفاقات. تاليف إمام شاه ولى الله دهلویؒ.
3۔ شاہ صاحبؒ کی اصل عربی عبارت یہ ہے: فالإرتفاق الأول مبنى على إرتفاق البهائم فزاد عليه بصفاء و إتصال ولطافة وظرافة كمثل إبتناء المعادن على المواليد .....الخ.
البدور البازغه. فصل فى بيان حقيقة الإرتفاقات الأربعه. صفحہ 64۔ طبع حیدرآباد، سندھ۔
ترجمہ از شاہ ولی اللہؒ کے عمرانی نظریے، از تالیف شمس الرحمٰن محسنیؒ۔ صفحہ: 59۔ طبع: لاہور۔
4۔ ولمّا كانت هٰذا الثّلثة لاتوجد فى جميع النّاس سواءً كان للإرتفاق حدّان: الأوّل هوالّذى لايمكن أن يّنفک عنه أهل الإجتماعيات القاصرة كأهل البدو وسكّان شواهق الجبال والنواحى البعيدة من الأقاليم الصّالحة ..... الخ.
حجة اللّٰه البالغه، باب كيفية الإستنباط الإرتفاقات. صفحه: 82. طبع: بيروت.
5۔ وهو الحكمة الباحثة عن كيفيّة حفظ الرّبط الواقع بين أهل المنزل على الحدّ الثّانى من الإرتفاق ...... الخ.
حجة اللّٰه البالغه، باب تدبير المنزل. جلد1. صفحه: 87، طبع: بيروت.
6۔ والأصل فى ذٰلک أنّه لمّا ازدحمت الحاجات وطلب الإرتفاق فيها على وجه تقربه الأعين تعذر إقامتها من كل واحد وكان بعضهم وجد طعاما فاضلا عن حاجة ..... الخ
حجة اللّٰه البالغة. باب فنّ المعاملات. جلد: 01. صفحه: 90. طبع: بيروت.
7۔ البدور البازغہ۔ فصل مبحث ارتفاق الثالث وتفصیل أقسامہ۔ ص: 91۔ طبع: حیدرآباد، سندھ۔
8۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک۔ تالیف: مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ ص: 149 تا 152۔ طبع: کتاب خانہ پنجاب، لاہور۔
9. البدور البازغه کی اصل عبارت یہ ہے: "واعلم أنّ للنّظام الإنسانى صحّة كاملة، ودونها صحّة ناقصة، ودونها مرض مدنِف، وبالجملة فمقتضى أصل طبيعة الإنسان الصّحّة الكاملة، وإذا نابت نوائب فى البدن فالصّحّة النّاقصة، أوالمرض المدنف. فالإرتفاق الأوّل .... الخ." البدور البازغه، صفحه95، طبع مجلس علمی، ڈابھیل.

علم افروز کتابیں

شعور و آگہی

امام عبیداللہ سندھیؒ





قرآنی شعورِ انقلاب

امام عبیداللہ سندھیؒ



رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور